ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر مہر محمد اعجاز صابر ۞

''اردو کی منظوم داستانیں'' کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

A Research and Analytical Study of *Urdu Ki Manzoom Dastanain*

By *Dr. Mehr Muhammad Ejaz Sabir, Associate Professor and Head of Urdu Department, Balochistan Residential College, Khuzdar.*

ABSTRACT

Dr Farman Fathepuri (1926-2013), a prominent research Scholar and Urdu Prose Writer is well known all over the world. He has to his credit many research papers and critical essays. He spent his whole life for the progress of Urdu language and literature. Being a greate proponent of the importance of Urdu literature, he did a lot of scholarly work for the promotion of the language and left around sixty two books for the guidance of Urdu lovers. *Urdu Ki Manzoom Daastanain* is his research work done for completion of his PhD from the University of Karachi. In this article, an analytical study of this research work is presented.

Keywords: Farman Fatehpuri, Research work, Manzoom daastanain, Literature, Urdu.

اُردو کی منظوم داستانیں ہیئت، موضوع، اُسلوب اور تاریخی ہر لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تفریح طبع کے ساتھ اُردو زبان کے فروغ و اشاعت کا سبب بنیں۔ ان کے ذریعے اس دَور کے ادبا و شعرا کی ذہنی و سماجی کیفیات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ عبدالقادر سروری (۱۹۰۶ء۔۱۹۷۱ء) لکھتے ہیں کہ:

> اُردو قصہ گوئی کی شکلوں اور اسالیب کے ارتقا کا مطالعہ، مثنوی کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ قدیم زمانے سے لے کر، لکھنؤ کے دَور تک، جتنے قصّے اُردو میں لکھے گئے، وہ منظوم ہیں، اور سب کے سب مثنوی میں ہیں۔ اُردو مثنویاں موضوع کے اعتبار سے، گویا اُردو قصّہ گوئی کی تاریخ کے ابتدائی ابواب ہیں۔ (۱)

۞ ایسوسی ایٹ پروفیسر صدر شعبۂ اردو، بلوچستان ریزیڈنشل کالج، خضدار۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

''اُردو کی منظوم داستانیں'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۴ء) کی نگرانی میں کام انجام دے کر اُنھوں نے ۱۹۶۴ء میں جامعہ کراچی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ ۱۹۷۱ء میں پہلی بار انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی نے شائع کیا۔اس کی دوسری اشاعت بھی ۲۰۰۲ء میں انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی کے زیرِ اہتمام عمل میں آئی۔ اس مقالے میں ۱۸۷۰ء تک کی اُردو منظوم داستانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔مقالہ چھ سو چوراسی صفحات پر مشتمل اور نو ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب ''منظوم داستانوں کی قدامت و اہمیت''، دوسرا باب ''منظوم داستانوں کی ہیت ترکیبی اور فنّی لوازم'' تیسرا باب ''اُردو میں منظوم داستانوں کا آغاز اور قدیم دکنی منظوم داستانیں''، چوتھا باب ''شمالی ہند میں منظوم داستانوں کا آغاز اور سماجی پس منظر''، پانچواں باب ''شخصی منظوم داستانیں یا آپ بیتیاں، چھٹا باب ''غیر شخصی مختصر عشقیہ منظوم داستانیں''، ساتواں باب ''غیر زبانوں سے ماخوذ داستانیں اور منظوم ترجمے''، آٹھواں باب ''بعض طویل اور اہم منظوم داستانوں کا تفصیلی مطالعہ'' اور نواں باب ''منظوم داستانوں کا عروج و زوال'' کے عنوان کے تحت مقالے میں شامل ہے۔ ان میں سے پہلے دو ابواب تمہیدی ہیں۔ پہلا باب ۲۲ صفحات اور دوسرا باب ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں دنیا کی مختلف قدیم تہذیبوں اور ادبیات کو زیرِ بحث لا کر ان کا اجمالی تاریخی و تہذیبی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان اَدوار کی منظوم داستانوں کی اوّلیّت، قدامت اور اہمیت کو مثالوں اور حوالوں کے ساتھ زیر بحث لایا گیا ہے۔ان ابواب میں اُردو زبان کے علاوہ مغربی ادب کی کُتب سے استفادے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ پہلے دو ابواب میں انگریزی کی بارہ کُتب، جب کہ اُردو زبان کی اکیس کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

داستانوں اور منظوم داستانوں سے متعلق مولانا الطاف حسین حالؔی، شبلؔی نعمانی، محمد حسین آزادؔ، مجنوں گورکھپوری، سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر احسن فاروقی، کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر گیان چند کی آرا کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں حالؔی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' (۱۹۵۳ء)، شبلؔی کی ''شعر العجم'' (طبع سوم، ۱۹۲۳ء)، مولانا محمد حسین آزادؔ کی ''آبِ حیات'' (۱۹۵۴ء)، سیّد وقار عظیم کی ''ہمارے افسانے'' (طبع دوم، ۱۹۵۰ء)، ''آغا حشر اور اُن کے ڈرامے'' (۱۹۵۴ء) اور ''ہماری داستانیں'' (۱۹۵۶ء)، عبدالقادر سروری کی ''اُردو مثنوی کا ارتقا'' (۱۹۴۰ء)، ڈاکٹر احسن فاروقی کی ''اُردو ناول کا فنی ارتقا'' (س ن)، کلیم الدین احمد (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۸۳ء) کی ''اُردو زبان اور فنِ داستان گوئی'' (س ن) اور ڈاکٹر گیان چند کی ''اُردو نثری داستانیں'' (۱۹۵۴ء) سے حوالے اور اقتباسات دیے گئے ہیں۔ تیسرے باب ''اُردو میں منظوم داستانوں کا آغاز اور قدیم دکنی منظوم داستانیں'' میں دکن کی منظوم داستانوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اُردو کی گیارہ کتابوں سے اڑتیس حوالے دیے گئے ہیں۔ استفادہ کی گئی کتابوں میں شمس اللہ قادری کی ''اُردوئے قدیم''

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

(۱۹۲۵ء)، عبدالقادر سروری کی ''اُردو مثنوی کا ارتقا'' (۱۹۴۰ء)، نصیر الدین ہاشمی کی ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' (۱۹۳۲ء) اور ''دکن میں اُردو'' (۱۹۵۲ء)، سیّد محی الدین زور قادری (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۲ء) کی ''دکنی ادب کی تاریخ'' (۱۹۶۰ء)، ڈاکٹر گیان چند کی ''اُردو نثری داستانیں'' (۱۹۵۴ء)، سیّد جلال الدین جعفری کی ''تاریخ مثنویاتِ اُردو''، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا مرتبہ ''کلیاتِ ولی''، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی ''علمی نقوش'' (۱۹۵۷ء) اور رسالہ اُردو (جولائی ۱۹۵۵ء) شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مقالے کے پیش لفظ میں واضح کیا ہے کہ اُن کے مقالے کا اصل مقصود صرف شمالی ہند کی منظوم داستانوں کا تحقیقی مطالعہ تھا لیکن اُنھوں نے ان کے پس منظر اور ان کے ارتقائی تسلسل کی وضاحت کے لیے دکنی منظوم داستانوں کے اجمالی ذکر کو ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر فرمان کے مقالے کے تیرہ سال بعد ڈاکٹر محمد اقبال جاوید نے ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں'' کے عنوان پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۷۷ء میں سندھ یونی ورسٹی جام شورو سے ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر محمد اقبال جاوید نے اپنے مقالے کے پیش لفظ میں ڈاکٹر فرمان کے مقالے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

> ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو کی منظوم داستانیں'' میں دکنی منظوم داستانوں کا ضرور جائزہ لیا ہے، لیکن اولاً یہ جائزہ اجمالی ہے ثانیاً اغلاط سے خالی نہیں۔ اس لیے اس سے خاطر خواہ استفادہ نہ کیا جا سکا۔(۲)

ڈاکٹر محمد اقبال جاوید نے دو نکتے اُٹھائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقالے میں دکنی داستانوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور دوم یہ کہ یہ جائزہ اغلاط سے خالی نہیں ہے۔ ان دونوں نکات کا جواب ڈاکٹر فرمان کے مقالے کے پیش لفظ میں موجود ہے۔ پہلے نکتے کے بارے میں پیش لفظ میں واضح ہے کہ:

> تیسرا باب اُردو میں منظوم داستانوں کا آغاز اور دکنی منظوم داستانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر چند کہ اس مقالے کا اصل مقصود صرف شمالی ہند کی منظوم داستانوں کا تحقیقی مطالعہ تھا، لیکن شمالی ہند کی منظوم داستانوں کے پس منظر اور ان کے ارتقائی تسلسل کو سمجھنے کے لیے دکنی منظوم داستانوں کا اجمالی ذکر ضروری تھا۔(۳)

دوسرا نکتہ کہ دکنی منظوم داستانوں کے بارے میں باب اغلاط سے خالی نہیں، جس کی وجہ سے اس مقالے سے استفادہ نہیں کیا گیا، کا جواب بھی پیش لفظ میں ڈاکٹر فرمان کی اس رائے میں موجود ہے کہ تحقیق خود تحقیق کی دشمن ہے، اس لیے وہ اپنی کسی رائے کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے۔(۴) ایک اور جگہ ڈاکٹر فرمان اس بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

> تحقیق کی راہ آسان نہیں ہوتی۔ اس میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آج جو چیز کارنامہ بن کر آتی ہے کل وہی اس تحقیق کے ہاتھوں مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ صرف علم و ادب نہیں سائنس کے انکشافات ونتائج بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔(۵)

ان اعتراضات کے باوجود ڈاکٹر محمد اقبال جاوید نے اپنے مقالے کا آخری باب، باب ششم بہ عنوان ''دکنی اُردو کی منظوم داستانوں کا مجموعی جائزہ'' ڈاکٹر فرمان کے اس مقالے سمیت اُن تمام ماخذات سے ترتیب دیا ہے، جنھیں ڈاکٹر فرمان نے اپنے مقالے میں استعمال کیا۔ دس صفحات پر مشتمل مذکورہ باب میں کل چھ حوالوں میں سے دو حوالے تو ڈاکٹر فرمان کے مقالے میں سے دیے گئے ہیں اور ایک ایک حوالہ مرتضیٰ احمد خان کی ''تاریخِ اقوامِ عالم''، ابن حنیف کی ''جلجامش''، ڈاکٹر گیان چند کی ''اُردو کی نثری داستانیں'' اور عبدالقادر سروری کی ''اُردو مثنوی کا ارتقا'' میں سے دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''اُردو کی منظوم داستانیں'' کی اس باب کے بارے میں رائے ہے کہ ''اُردو ادبیات کا آغاز دکن سے ہوتا ہے اس لیے سب سے پہلے دکنی ادبیات کے عمومی جائزہ میں اس دور کی اہم منظوم داستانوں کا مطالعہ اور ان کے فنی لوازم سے بحث کی گئی ہے جو بذاتِ خود جداگانہ تحقیقی کارنامہ ہے۔''(۶)

باب کے آغاز میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دکن میں اُردو زبان کی آمد، شمالی ہند کے مقابلے میں دکن کے ساز گار ماحول، اور اس کے پروان چڑھنے کے حوالے سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے موضوع کو گرفت میں لینے کے لیے اُن محرکات کا جائزہ پیش کیا ہے، جن کے تحت شمالی ہند کے مسلمان حکمران دکن کی طرف متوجہ ہوئے اور علاؤالدین خلجی نے یہاں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو زیرِ نگین بنایا اور مسلمانوں کی بڑی تعداد یہاں وارد ہوئی اور نتیجے میں معاشرتی و تجارتی تعلقات کے ساتھ مسلمانوں کا سیاسی تعلق بھی دکن سے مضبوط ہوا۔ دولت آباد کو پایۂ تخت بنائے جانے کے بعد اُردو زبان کو جو فروغ حاصل ہوا، اس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان کا تجزیہ اس طرح ہے کہ:

> جب محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد کو دارالخلافہ بنانے کا حکم دیا تو تقریباً پوری دلّی اٹھ کر دکن پہنچ گئی اور اپنے ساتھ ایک نئی زبان بھی لے گئی۔ اس زبان کا نام ہندوی یا ہندی تھا اور مسلمان و ہندو دونوں کی معاشرتی ضرورتوں سے وجود میں آئی تھی۔ یہی زبان شمالی ہند سے دکن پہنچی اور وہاں کے مختلف علاقوں میں اس کا نام دکنی اور گجراتی یا گجری رکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دکن کا لفظ شمالی ہند کے مقابل استعمال کیا جاتا تھا۔ اُردو کے لیے دکن کا علاقہ شمالی ہند کے مقابلے میں زیادہ ساز گار ثابت ہوا، بلکہ حقیقت میں یہی وہ علاقہ ہے جس نے سب سے پہلے اس نوخیز زبان کو اپنایا اور اس طرح پروان

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

چڑھایا کہ آگے چل کر اس نے سارے برصغیر پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔(۷)

بہمنی سلطنت (۷۴۷ھ تا ۹۳۲ھ) کے بعد مسلمانوں کی قائم ہونے والی سلطنتوں کو اُردو ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ اگر چہ بہمنی دَورِ حکومت میں دکنی اُردو میں تصنیف و تالیف شروع ہوگئی تھی، لیکن عادل شاہی (۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ) اور قطب شاہی (۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ) حکمرانوں کی سر پرستی کی وجہ سے اُردو بہت جلد ایک علمی و ادبی زبان بن گئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

> شمالی ہند میں اُردو کی ادبی محفل جمنے اور دہلی میں ولی اور دیوانِ ولی کے آنے سے بہت پہلے دکنی اُردو میں گراں بہا ادبی سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔ اس ادبی سرمائے میں نثر کے مقابلہ میں شعری ادب زیادہ وقیع و کثیر ہے۔ شعری ادب میں بھی بعض اصناف پر خصوصیت سے توجہ دی گئی ہے۔ ان میں ادبی محاسن و کمالات کے اعتبار سے، مثنویوں کا پلّہ بھاری ہے۔ مثنویوں میں بھی مقدار و معیار دونوں لحاظ سے دکنی مثنویاں یا منظوم داستانیں ہی قدیم دکنی ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔(۸)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، عبدالقادر سروری کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ قدیم سے لے کر لکھنؤ کے دور تک جتنے قصے اُردو میں لکھے گئے، وہ منظوم اور مثنوی میں ہیں اور اُردو مثنویاں موضوع کے لحاظ سے اُردو قصّہ گوئی کی تاریخ کے ابتدائی ابواب ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دکن میں منظوم داستانوں کے فروغ، قبولِ عام، نیز شعرا کی مثنوی کو داستان گوئی کے لیے اپنانے کے اسباب پر خطے کے تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں بحث کی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اس مطالعے کو اُن کی اس عبارت سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> دکن بشمول گجرات، مسلمان بزرگوں اور صوفیوں کا قدیم مرکز تھا اور یہ صوفی بزرگ تبلیغ اسلام کی غرض سے عربی و فارسی کے بجائے مقامی زبان میں درس دینا زیادہ مفید و مناسب خیال کرتے تھے، اس طرح عوام میں اُردو کی قبولیت بڑھی اور جب انھیں بزرگوں میں سے بعض کے قدم دربار شاہی تک پہنچے تو امرا و رؤسا اور بادشاہوں کے درباروں تک اُردو کی بھی رسائی ہوگئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بہمنی عہد سے مقامی زبان کو درباروں، دفتروں اور عدالتوں میں جگہ ملنے لگی تھی اور یہ تبدیلی غالباً اس غرض سے کی گئی تھی کہ دکنی آزاد حکومت شمالی ہند سے بغاوت یا انحراف پر قائم تھی اور مقامی لوگوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ ان کی زبان کی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

> سرپرستی کی جائے۔ ان حالات میں ابتداً بعض بزرگوں نے مولانا روم کی ''مثنوی معنوی''، جامی کی ''یوسف زلیخا'' اور عطار کی ''منطق الطیر'' کے طرز پر اصلاحی اور روحانی مقاصد کے لیے چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور کہانیوں کو اُردو نظم کا جامہ پہنایا اور جیسے جیسے اُردو میں جامعیت پیدا ہونے لگی ہر قسم کی داستانیں نظم ہونے لگیں اور عشقیہ و مصلحانہ داستانوں کے ساتھ ساتھ شاہنامہ اور سکندر نامہ کے طرز پر علمی نامہ، خاور نامہ اور ظفر نامہ جیسی رزمیہ داستانیں بھی وجود میں آ گئیں۔(۹)

دکن میں مذاقِ شعر و سخن اور دکنی شعرا میں داستان کو شعر کا جامہ پہنانے اور طویل رزمیہ مثنویاں کہنے کے پیچھے شاہانِ دکن کی علم دوستی، دل چسپی اور سرپرستی کے ساتھ اُن کے عہد کی عام خوش حالی، شعرا کی فارغ البالی و آسودگی اور عام اطمینان بخش زندگی کو قرار دیتے ہوئے دکنی منظوم داستانوں کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔اس بحث کے مطابق دکن کے اکثر قصّے عشقیہ ہیں۔ان قصّوں میں مافوق الفطرت عناصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا ہیرو مشکلات و مہمات کا مقابلہ کر کے ہیروئین کو حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رزمیہ قصّوں میں بھی کسی نہ کسی عشقیہ قصّے کا عمل دخل ہوتا ہے۔ چند طبع زاد قصّوں کے سوا، باقی فارسی قصّوں کے تراجم یا ان سے ماخوذ ہیں۔ ہیت کے لحاظ سے دکن کے تمام منظوم قصّے، مثنویوں کی صورت میں ہیں۔ ان قصّوں میں فنی و ادبی محاسن پائے جاتے ہیں اور یہ اپنے دَور کی عام زندگی کے ترجمان ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

> دکنی شعرا نے بھی فارسی شعرا کی تقلید و اتباع میں اسی صنف کو اپنا لیا اور یہ تقلید ایسی مقبول ہوئی کہ آج تک جتنے قصّے اُردو میں نظم ہوئے ہیں ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب مثنوی ہی کی صورت میں ہیں۔(۱۰)

بہمنی دور کے فخر الدین نظامی دکنی کی ''کدم راؤ اور پدم'' کو تاریخی نقطۂ نظر سے اُردو کی پہلی مثنوی قرار دیا ہے، جس میں داستان نظم کی گئی ہے اور جسے عادل شاہی یا قطب شاہی کے دور سے پہلے ۸۶۵ء اور ۸۶۷ء کے درمیانی زمانے میں نظم کیا گیا۔نصیر الدین ہاشمی، محی الدین قادری اور مولوی عبدالحق کے حوالوں سے یہی سنِ تصنیف، جب کہ مخطوطات انجمن ترقی اُردو کی جلد اوّل کے مرتبین کے حوالے سے اس کا سنِ تصنیف ۸۲۵ء تا ۸۳۸ء دیا گیا ہے۔ڈاکٹر خان رشید نے طویل مثنوی کی تاریخ میں ''کدم راؤ اور پدم راؤ'' کو اوّلیّت کا حامل قرار دیا ہے۔(۱۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق بہمنی دور میں اس مثنوی کے سوا کوئی دوسری منظوم داستان نہیں لکھی گئی۔البتہ گجرات میں خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' کو منظوم داستانوں کی اہم کڑی قرار دیا ہے۔ اس کے بعد عہدِ عادل شاہی میں لکھی گئی منظوم داستانوں کا اجمالی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

تعارف کرانے کے ساتھ اس دَور کے منظوم قصّوں کی فہرست دی ہے،جن میں گیارہ مثنویاں چندر بدن ومہیار، مصنفہ مقیمیؔ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۵۰ھ)، بہرام و حسن بانو (نامکمل) مصنفہ امینؔ دکنی (۱۰۵۰ھ)،قصہ بے نظیر مصنفہ صنعتیؔ (۱۰۵۵ھ)، قصہ ملکہ مصر (نامکمل)، مصنفہ صنعتی (سال تصنیف نامعلوم)،ہشت بہشت، مصنفہ ملک خوشنود (۱۰۵۶ھ)،خاور نامہ، مصنفہ رستمیؔ (۱۰۵۹ھ)، بہرام وحسن بانو(امین کی مثنوی کی تکمیل)(۱۰۶۶ھ)،گلشنِ عشق، مصنفہ نصرتیؔ (۱۰۶۸ھ)،علی نامہ(۱۰۷۶ھ)،قصص الانبیا منظوم،مصنفہ قدرتیؔ (۱۰۹۴ھ) اور یوسف زلیخا مصنفہ ہاشمی (۱۰۹۹ھ) شامل ہیں۔

اس عہد، عہد عادل شاہی کے مقیمیؔ کی مثنوی ''چندر بدن مہیار'' کو اس کا طبع زاد قصّہ قرار دیا گیا ہے، جسے اُس نے غواصیؔ کی مثنوی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' سے متاثر ہو کر نظم کیا اور بعد کے اکثر شعرا نے تلمیحاً اس کا ذکر اپنے کلاموں میں کیا۔[۱۲] ڈاکٹر گیان چند نے مقیمیؔ کی اس مثنوی کو اہم قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بعد میں میرؔ، ناسخؔ اور مصحفیؔ نے اس مثنوی کے رنگ کو اپنایا۔[۱۳] ڈاکٹر فرمان نے مثنوی کے ہیرو کا تعلق سندر پٹن سے لکھا ہے۔[۱۴] جب کہ ڈاکٹر گیان چند نے چندرئین لکھا ہے۔[۱۵] ڈاکٹر گیان چند کے مطابق ڈاکٹر زور اور نصیر الدین دونوں مرزا محمد مقیم اور مقیمی کو ایک ہی شخص سمجھتے ہیں، جس نے مثنوی چندر بدن مہیار لکھی، لیکن درحقیقت یہ دو الگ شخصیتوں کے نام ہیں۔ان میں سے مقیمی نے چندر بدن مہیار لکھی، جب کہ مرزا محمد مقیم بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے، جن کی ایک اُردو مثنوی فتح نامہ بکھیری ڈاکٹر جمیل جالبی نے دریافت کی۔[۱۶]

ملک خوشنود کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کو فارسی سے دکنی نظم میں منتقل قصّے کے طور پر متعارف کراتے ہوئے، اس کا سن تصنیف ۱۰۵۶ھ کے لگ بھگ قرار دیا گیا ہے، جس کا یہ ترجمہ سلطان محمد عادل شاہ کے ایما پر کیا گیا۔[۱۷] ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے ملک خوشنود کی دو مثنویاں ''ہشت بہشت'' اور ''بازار حسن'' کے نام سے بتائیں، لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے تصحیح کرتے ہوئے ان دونوں کو ایک ہی مثنوی لکھا اور قرار دیا کہ اس کا درست نام ''جنت سنگار'' ہے۔[۱۸]

دکنی دَور کے دوسرے اہم مرکز گولکنڈہ پر بحث کرتے ہوئے قطب شاہی دَور کے منظوم قصّوں کے تعارف کے بعد اس دَور کے منظوم قصّوں کی فہرست دی ہے۔اس فہرست میں پندرہ مثنویاں سیف الملوک و بدیع الجمال، مصنفہ غواصیؔ، (۱۰۳۵ھ)، چندر اور لوک، مصنفہ غواصیؔ (قبل ۱۰۳۵ھ)، قطب مشتری، مصنفہ وجہیؔ (۱۰۲۰ھ)، طوطی نامہ، مصنفہ غواصیؔ (۱۰۲۹ھ)، لیلیٰ مجنوں، مصنفہ احمدؔ (سن تصنیف نا معلوم)، ماہ پیکر، مصنفہ جنیدیؔ (۱۰۶۴ھ)، پھول بن، مصنفہ ابن نشاطیؔ (۱۰۶۶ھ)، قصہ بہرام وگل اندام، مصنفہ طبعیؔ (۱۰۸۱ھ)، قصہ ابوشحمہ، مصنفہ امینؔ، (۱۰۹۰ھ)، پدماوت، مصنفہ غلام علیؔ (۱۰۹۱ھ)، جنگ نامہ، مصنفہ سیوکؔ (۱۰۹۲ھ)، قصہ زقوم بادشاہ، مصنفہ خاکی یا فتاحی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

(۱۰۹۲ھ)، قصہ رضوان شاہ، مصنفہ فائزؔ (۱۰۹۴ھ)، ظفر نامہ، مصنفہ لطیفؔ (۱۰۹۵ھ) اور قصہ مہر و ماہ یا ظفر نامہ، مصنفہ مظفرؔ (سن تصنیف نا معلوم) شامل ہیں۔ یہ فہرست دینے سے پہلے لکھتے ہیں کہ سال تصنیف کے اعتبار سے ان مثنویوں کی تاریخی ترتیب درج کی جارہی ہے۔[۱۹] لیکن فہرست میں تاریخی ترتیب کو پوری طرح ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔

مثنوی ''قطب مشتری'' کے مصنف کا نام ملا وجہی یا وجیہی بتایا ہے، جو محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔ ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں'' میں ڈاکٹر محمد اقبال جاوید نے لکھا ہے کہ اس کا اصلی نام اسد اللہ، لقب وجیہہ الدین محمد، اور تخلص وجہی، وجیہی اور وجیہہ ہے۔[۲۰] ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے قطب مشتری کو طبع زاد داستان کہا ہے اور وہ اس کا ہیرو محمد قلی قطب شاہ کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اکثر محققین کے مطابق اس مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے اُس معاشقے کا ذکر ہے، جو قطب شاہ کو اُن کے جوانی کے زمانے میں پیش آیا تھا، لیکن مولوی عبدالحق کی رائے میں اس معاشقے کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔[۲۱] ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں'' میں قطب مشتری کا ماخذ شیخ جمالی کنبوہ المتوفی ۹۴۲ھ/ ۱۵۳۵ء کی مثنوی مہر و ماہ کو قرار دیا گیا ہے، لیکن حوالہ نہیں دیا گیا۔ تاہم قطب مشتری اور مہر و ماہ کے قصّے کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔[۲۲] ڈاکٹر شیراز زیدی کا کہنا ہے کہ سیّدہ جعفر کی تحقیق کے مطابق قطب مشتری کے قصّے کا محمد قلی قطب شاہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[۲۳]

غواصیؔ کی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' (۱۰۳۵ء) کو الف لیلہ کی داستان سے ماخوذ کہا گیا ہے اور شمس القادری کی رائے بھی دی گئی ہے، جس کے مطابق یہ مثنوی الف لیلہٰ کے فارسی نثری ترجمے کا منظوم ترجمہ ہے، جسے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مرزا بدیع اصفہانی نے شمشیر خاں کی فرمائش سے فارسی میں نظم کر کے ''گلدستۂ عشق'' کا نام دیا۔ ڈاکٹر محمد اقبال جاوید کے مطابق غواصیؔ ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کو طبع زاد ثابت کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ ۲۴۔ غواصیؔ کی دوسری مثنویہ داستان ''مینا ستونتی'' کا ذکر نہیں کیا گیا، جسے ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں'' میں شامل کیا گیا ہے اور مصنف کا کہنا ہے کہ یہ غواصیؔ کی اہم مثنوی ہے، لیکن بعد میں دریافت ہونے کی بنا پر اس کا ذکر اُردو شہ پارے، اُردوئے قدیم، دکن میں اُردو، اُردو مثنوی کا ارتقا میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر فرمان اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں کہ ''چمنستان شعرا'' میں غلطی سے ''طالب و موہنی'' کے قصّے کو غلام قادر نامی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اُن کے خیال میں عبدالقادر نامی نے، جو عشقیہ داستان نظم کی، اس کا نام ''سروشمشاد'' ہے، جو سات ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔[۲۵] ''کدم راؤ پدم راؤ'' اور عادل شاہی و قطب شاہی دَور میں لکھی جانے والی دکنی منظوم داستانوں کی دوبارہ ایک فہرست یک جا کر کے دی گئی ہے اور توجیہہ پیش کی گئی ہے کہ بہمنی عہد سے لے کر آصفیہ عہد تک کے چار سو سالہ فاصلے نے دکنی منظوم قصّوں کے تاریخی خاکے کو ذہن سے اوجھل کر دیا ہوگا، اس لیے ان کی تاریخی ترتیب و تسلسل، ان کے سال تصنیف اور عہد

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

حکومت کو آسانی سے ذہن میں رکھنے کے لیے فہرست مع تاریخِ تصنیف اور مصنف دی جا رہی ہے۔[۲۶] چوں کہ ان داستانوں کو زیرِ بحث لایا جا چکا ہے اور قطب شاہی و عادل شاہی ادوار کے حوالے سے ان کی الگ الگ فہرست پہلے دی جا چکی ہے، اس لیے یہاں دوبارہ اس فہرست کی ضرورت نہیں تھی، البتہ باب کے آغاز میں ان قدیم دکنی منظوم داستانوں کی فہرست دے دی جاتی، تو اس موضوع پر کام کرنے والے محققین، طلبہ اور ادب کے قارئین کے لیے آسانی ہوتی۔

ڈاکٹر فرمان قدیم دکنی منظوم داستانوں پر بحث سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ دکنی دَور کی زیادہ مثنویاں ایسی ہیں، جن کا مقصد عشق حقیقی کے نکتے سمجھانا ہے، لیکن واقعات و حالات ایسے مجازی انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ ان میں قصّے پن کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ خوب ترنگ، ہشت بہشت، پدماوت، وصال العاشقین، یوسف زلیخا، گلشن حسن و دل، عشقِ صادق اور بوستان خیال وغیرہ کو اُنھوں نے ایسی ہی داستانیں کہا ہے۔ علی نامہ، ظفر نامہ، جنگ نامہ اور جنگ نامۂ حیدر کو رزمیہ نظموں کی صف میں شامل کیا ہے اور باقی قصّوں کو عام عشقیہ انداز کے قصّے کہا ہے، جن میں چند ایک کے سوا سب کے سب فارسی و ہندی قصّوں سے ماخوذ یا ان کے تراجم ہیں۔ مشہور اور اہم مثنویوں میں صرف ملا وجہی کی ''قطب مشتری'' اور مقیمیؔ کی ''چندر بدن و مہیار'' کے علاوہ ''بوستان خیال'' کو طبع زاد کہا گیا ہے۔ نیہ درپن، قصّہ زقوم شاہ، قصّۂ بے نظیر، ماہ و پیکر، قصّۂ مہر و ماہ، ابوشحمہ، ملکۂ مصر، طالب و موہنی اور گلدستہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان مثنویوں کا سراغ نہیں لگ سکا کہ یہ طبع زاد ہیں یا تراجم، لیکن ان کی تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ یہ پرانے قصّوں سے ماخوذ ہیں۔[۲۷] ماہ و پیکر، قصّۂ ابوشحمہ، قصّۂ رضوان شاہ، قصّۂ ملکۂ مصر اور لعل و گوہر کو ڈاکٹر گیان چند کے حوالے سے طبع زاد بتاتے ہوئے،[۲۸] ان میں سے قصّہ رضوان شاہ اور لعل و گوہر کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ یہ دونوں قصّے یقینی طور پر فارسی سے آئے ہیں۔ ان مثنویوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اُن کا کہنا ہے کہ زبان و بیان میں دَورِ مغلیہ کے بعد کے قصّے زیادہ صاف اور عام فہم ہیں۔ بحر و وزن کی اگرچہ کوئی قید نہیں تھی، لیکن سحرالبیان کا وزن دکن میں زیادہ مقبول رہا۔ اُردو کی پہلی منظوم داستان کدم راؤ پدم راؤ اور آخری دَور کی سب سے بہتر مثنوی بوستان خیال، دونوں سحرالبیان کی بحر میں ہیں۔[۲۹]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ موضوع اور فضا کے اعتبار سے کوئی مثنوی مافوق الفطرت عناصر سے خالی نہیں ہے۔ کہیں دیو، پری اور جن موجود ہیں، کہیں مافوق قوتوں کو آدمیوں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ دکنی منظوم قصّوں سے شمالی ہند کو استفادے کا موقع مغلوں کے دَور میں ملا ہے۔[۳۰] ''بوستان خیال'' کا، جو خلاصہ دیا گیا ہے، ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اس سے ذرا مختلف واقعہ تحریر کیا ہے۔[۳۱]

چوتھے باب میں شمالی ہند میں منظوم داستانوں کے آغاز کا اس عہد کے سیاسی و سماجی پس منظر میں مطالعہ پیش کیا گیا

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پیش لفظ میں روشنی ڈالی ہے کہ اس باب کا تعلق شمالی ہند کی منظوم داستانوں کے سیاسی و سماجی پس منظر سے ہے اور یہ کہ صرف اُن تاریخی واقعات کا اجمالی ذکر کیا جائے گا جن سے اُردو شاعری کسی طور متاثر ہوئی اور جن کا ذکر کیے بغیر منظوم داستانوں کے عروج و زوال کی تاریخ کو سمجھنا مشکل ہے۔اکیس صفحات پر محیط اس باب میں اُردو کی اُنیس (۱۹) اور انگریزی کی ایک کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ان میں آزاد کی ''آبِ حیات'' (۱۹۵۷ء)، مولوی عبدالحق کی مرتبہ ''مخزن نکات'' (۱۹۲۹ء)، ''ذکرِ میر'' (۱۹۲۸ء)، ''نکات الشعرا'' (۱۹۳۵ء)، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی ''شاہ حاتم، حالات و کلام'' (۱۹۶۴ء)، ہاشمی فرید آبادی کی ''تاریخِ مسلمانان پاکستان و بھارت'' جلد اوّل، دوم (۱۹۵۳ء)، ڈاکٹر صابر علی خاں کی ''سعادت یار خان رنگین'' (۱۹۵۶ء)، مرزا مہدی کی ''تاریخ جہان کشائے نادری'' (س۔ن)، عبدالباری آسی کی ''دو نایابِ زمانہ بیاضیں اور ان کا انتخاب'' (۱۹۴۲ء)، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ''جرأت، ان کا عہد اور شاعری'' (۱۹۵۴ء)، ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' (۱۹۵۵ء)، ''مصحفی اور ان کا کلام'' (س۔ن) ڈاکٹر محمد حسن کی ''دہلی میں اُردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر'' (۱۹۶۴ء)، ڈاکٹر تارا چند کی ''تاریخِ اہلِ ہند'' (س۔ن)، ڈاکٹر وحید قریشی کی ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' (۱۹۵۹ء)، غلام رسول مہر کے مرتبہ ''خطوطِ غالب'' جلد اوّل، کلیات جعفر علی خان حسرت قلمی مرقومہ (۱۱۸۲ء) کتب خانہ خاص، انجمن ترقی اُردو کراچی، نگار لکھنؤ، اصناف سخن نمبر (۱۹۵۷ء) اور J. N. Sarka کی Fall of Mughal Empire شامل ہیں۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا عام رواج اٹھارویں صدی عیسوی یا بارھویں صدی ہجری کے اوائل سے ہوا۔ڈاکٹر فرمان نے اسی تناظر میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت، اُس کی وفات (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء)، شہزادوں اور نئے حکمرانوں کی خانہ جنگیوں، شہزادہ معظم شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کی تخت نشینی (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء)، اُس کے پانچ سالہ دَورِ حکومت اور ۱۱۲۳ھ/ ۱۷۱۲ء میں اُس کی وفات کے بعد اُس کے چاروں بیٹوں میں تخت نشینی کے جھگڑوں سے لے کر ۱۷۱۲ء میں جہاں دار شاہ جیسے ناکارہ اور عیاش شخص کے اقتدار میں آنے اور اسی سال فرخ سیر کے ہاتھوں جہاں دار شاہ اور اُس کے وزیر ذوالفقار کے قتل، فرخ سیر کی تخت نشینی اور ۱۷۱۹ء میں سادات بارہہ کی طرف سے اُس کی معزولی اور بعد ازاں قتل کروانے اور اسی سال چند ماہ کے لیے رفیع الدرجات اور اُس کے بھائی رفیع الدولہ کے یکے بعد دیگرے دلّی کے تخت نشین ہونے کی تاریخ دہرائی ہے۔اس کے بعد روشن اختر محمد شاہ، جس نے ۱۷۱۹ء/ ۱۱۳۱ھ میں تخت دلّی سنبھالا اور تیس سال تک حکمران رہا، کے دَور کے حالات و واقعات، اُس کے طرزِ حکومت، بدانتظامیوں اور ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۳۹ء کے نادر شاہ درانی کے حملے اور مغلیہ سلطنت کی بنیاد کمزور ہونے کے حوالے سے حقائق و واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔سندھ، افغانستان اور پنجاب کے صوبے کا مغلوں کے ہاتھ سے نکلنا، سکھوں اور مرہٹوں کا سر اُٹھانا، دکن، اودھ اور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

دور دراز علاقوں کے صوبہ داروں کی طرف سے اپنی اپنی خودمختار سلطنتوں کے قیام کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۷۴۷ء/ ۱۱۶۱ھ میں روشن اختر محمد شاہ کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے احمد شاہ کی رنگ رلیوں، ۱۷۴۹ء/ ۱۱۶۲ھ میں احمد شاہ ابدالی کے حملے، ۱۷۵۴ء/ ۱۱۶۷ھ میں احمد شاہ کی معزولی اور غازی الدین خاں عماد الملک کی طرف سے اختیارات اپنے پاس رکھ کر عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کا نام دے کر دلّی کے تخت پر بٹھانے کو زیر بحث لا کر ڈاکٹر فرمان کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کو مشکل سے پچاس سال ہوئے تھے کہ مغلیہ سلطنت سیاسی اور اقتصادی طور پر یکسر تباہ ہو گئی۔[۳۲] اس عہد کی تصویر کشی کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان نے ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کے ایک اور حملے کو دلّی کی باقی ماندہ تباہی قرار دیا ہے اور میر تقی میرؔ کی ذکرِ میرؔ سے میرؔ کی ایک عینی شاہد کی حیثیت سے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں تباہ کاریوں کا احوال بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی کو ہٹا کر شاہ عالم کو دلّی کا بادشاہ اور شجاع الدولہ کو اُس کا وزیر مقرر کر دیا۔ غلام قادر روہیلہ نے بادشاہ کی آنکھیں نکلوا دیں اور یہ نابینا بادشاہ ۱۷۶۱ء/ ۱۱۷۱ھ تا ۱۸۰۳ء/ ۱۲۱۸ء تک اقتدار میں رہا، لیکن عملاً دلّی کی سلطنت مغلوں کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ بنگال پر ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد انگریز قبضہ کر چکے تھے۔ ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر میں شاہ عالم کی فوج کو شکست ہوئی اور نتیجتاً دہلی کی مرکزی حکومت بھی سیاسی طور پر انگریزوں کے زیرِ اثر آ گئی۔ شاہ عالم کے بعد اکبر ثانی تخت نشین ہوا تو دلّی ہاتھ سے نکل چکی تھی، صرف لال قلعہ پر بادشاہ کا قبضہ باقی تھا۔ اس کے بعد کی صورتِ حال اور عہدِ انتشار کے بارے میں مختلف شعرا و ادبا کی تحریروں کی مدد سے جائزہ پیش کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اُردو شاعری میں اس دَور کی سیاسی و اقتصادی بدحالی اور افراتفری کی تصویر کشی موجود ہے اور اس عہد کی زندگی کے آثار مثنوی، غزل، شہر آشوب اور قصائد تک میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس بارے میں مصحفیؔ کے قصیدے کے چند اشعار نقل کیے گئے ہیں:

کہتی ہے اسے خلقِ خدا سب شہِ عالم
شاہی جو کچھ اس کی ہے وہ عالم پہ عیاں ہے
اس شہر کے باشندوں سے جا کر کوئی پوچھے
جُز خونِ جگر کچھ بھی غذائے دل و جاں ہے
بازار نشیں تھا جو کوئی صاحبِ حرفہ
اب شہر میں، سو اس کو کہوں کیا وہ کہاں ہے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اے مصحفیؔ اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشنِ دہلی میں خزاں ہے[۳۳]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء کے درمیانی عہد کی دہلی کی سیاسی بدنظمی، اقتصادی ابتری و بدحالی اور سماجی پراگندگی و افراتفری کو ایسی صورتِ حال قرار دیا ہے جس کی وجہ سے معاشرے کے تمام طبقات بلاتفریق مفلسی، بدامنی اور بدحالی کا شکار تھے۔ ان میں شعرا و ادبا بھی شامل تھے، جو معاشی طور پر کمزور ہو کر دہلی کو خیر باد کہہ کر فرخ آباد، فیض آباد، لکھنؤ اور عظیم آباد کا رخ کر رہے تھے۔[۳۴] حاتمؔ، میر تقی میرؔ، سوداؔ اور نظیر اکبر آبادی کی نظمیں اور شہر آشوب آگرہ اور دہلی کی سیاسی و سماجی اور اقتصادی زندگی کا عکاس بتائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان کے مطابق دہلی کی اُردو شاعری کے اس پس منظر میں اطمینان و فارغ البالی تو درکنار عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل تھا۔ حاتمؔ، فغاںؔ، آبروؔ، سوداؔ، میرؔ، دردؔ، سوزؔ، مظہرؔ، قائمؔ، میر حسنؔ، مصحفیؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ جیسے نامور شعرا اس زوال پذیر معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان دہلی کی اس پُر آشوب فضا کو طویل نظم کہنے کے لیے ساز گار قرار نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ اس پُر آشوب فضا میں منتشر خیالات کو نظم کرنے کے سوا کسی مسلسل خیال کو طویل نظم کی صورت میں نظم کرنے کا موقع نہیں تھا۔ تسلسل خیالات، واقعات و جذبات کی مصوری، خارجی ماحول کی منظر نگاری، اُسلوب کی دل کشی و سیرت نگاری کے بغیر کامیاب طویل منظوم داستان یا مثنوی وجود میں نہیں آسکتی۔ داستان منظوم ہو یا منثور ذہنی سکون و معاشی بے فکری کے بغیر آگے نہیں بڑھتی۔[۳۵] ڈاکٹر فرمان دہلی کی فضا کو ان خصوصیات سے عاری قرار دیتے ہیں اور دہلوی شعرا کی اپنے تمام تر فنی کمالات کے باوجود قیام دہلی کے دَور تک منظوم داستان یا طویل افسانوی مثنوی میں کوئی غیر معمولی یادگار نہ چھوڑنے کا سبب اسی کو گردانتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس کے باوجود دہلوی شعرا منظوم قصّوں سے یکسر غافل نہیں رہے اور اُنھوں نے ابتدائی دَور ہی سے اس کی طرف توجہ دی ہے۔ طویل منظوم قصّوں کی بجائے بے شک یہ قصّے مختصر سہی، جنھیں فنی نقطۂ نگاہ سے کامل نہیں کہا جا سکتا، زبان و بیان کے اعتبار سے ادب کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں اور ان میں سادگی و صفائی، حقیقت پسندی، سوز و گداز اور حسن و اثر جیسے عناصر موجود ہیں۔[۳۶] اس بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ ''دہلوی شعرا شمالی ہند میں منظوم افسانے کی بنا ڈالنے والوں میں سے ہیں۔ اُنھوں نے حد درجہ ناسازگار حالات میں بھی حسب مقدور بہت سے مختصر منظوم افسانے لکھے ہیں اور یہی دہلوی شعرا دلّی سے تنگ آ کر جب فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے ہیں تو اُنھوں نے ''سحر البیان'' جیسی شاہکار منظوم داستان یادگار چھوڑی ہے۔''[۳۷]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۱۷۳۹ء کے بعد تنگ دستی اور معاشی خستہ حالی سے مجبور شرفا و صاحبانِ کمال کی دہلی سے لکھنؤ نقل مکانی کو زیرِ بحث لائے ہیں، جہاں پہنچنے کے بعد اُنھیں قدرے آسودگی کی زندگی نصیب ہوئی۔ شجاع الدولہ اور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

آصف الدولہ کی قدر دانی اور سرپرستی کا ذکر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اطراف و اکناف کے اہلِ علم وفن لکھنؤ آئے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اودھ کی خوش حالی اور امن و آشتی کا ذمہ دار انگریزوں کو ٹھہراتے ہیں، جن کی سرپرستی میں یہ سلطنت دہلی کو کمزور کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریز فوج اس قدر مضبوط ہو گئی تھی کہ کسی راجا یا نواب میں اُن سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے اُن کی سرپرستی میں چلنے والی اس سلطنت کی طرف کسی میں آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ تھی۔ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد دہلی کی طرح لکھنؤ کی محفلِ شعر و سخن بھی بجھ گئی۔ لکھنؤ کے اس سیاسی و سماجی پس منظر کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس خطے میں شعر و سخن کے فروغ پر بحث کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ دہلی میں شاعروں نے بالعموم غزل اور قصیدے کہے، لیکن لکھنؤ میں مرثیے اور مثنوی نے خاص طور پر فروغ پایا۔ یہاں کی خوش حالی و فارغ البالی نے شعرا کو طویل نظمیں کہنے کی طرف راغب کیا اور مثنوی کی شکل میں داستان نظم کرنے کا رواج عام ہوا۔(۳۸)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھنؤ کی ساز گار ادبی فضا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> افسانوی مثنوی کے اہم لوازم مثلاً عشقیہ قصّوں کے لیے ہیرو اور ہیروئن کے انتخاب، جذبات کی مصوری، واقعہ نگاری و سیرت نگاری، بزمِ رقص و سرود کی تصویر کشی اور خارجی زندگی کی منظر نگاری کے لیے جو مواد لکھنؤ میں موجود تھا وہ دہلی کی پر آشوب فضا میں میسر نہ تھا۔ اس لیے لکھنؤ نے منظوم داستانوں کو فنی نقطہ نظر سے عروج کی جس منزل تک پہنچا دیا وہ دہلی سے نہ بن سکا۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ لکھنؤ میں شعر و سخن کی بنا ڈالنے والے اور ان کے متعلقین و متوسلین زیادہ تر دہلی کے پروردہ و تربیت یافتہ تھے۔ دوسرے یہ بعہد آصف الدولہ جب دہلوی شعرا لکھنؤ پہنچے اور نہایت سیر چشمی و فراخ دلی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا تو انھوں نے غزل سے ہٹ کر منظوم افسانوں کی طرف بھی خصوصی توجہ کی۔(۳۹)

اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ میرؔ، سوداؔ، قائمؔ اور مصحفیؔ نے منظوم افسانوں کی طرف متوجہ ہو کر اکثر عشقیہ مثنویاں لکھنؤ میں لکھی ہیں۔ ''سحر البیان'' بھی لکھنؤ میں وجود میں آئی ہے۔ دہلوی شعرا نے لکھنؤ پہنچ کر آپ بیتی اور جگ بیتی پر مبنی ہر قسم کے قصّے نظم کیے اور ان منظوم قصّوں نے اہلِ لکھنؤ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں دبستانِ لکھنؤ نے کسی اور صنفِ ادب میں دہلی کی پیروی کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن افسانوی مثنوی کے میدان میں ضرور اثر قبول کیا۔ دہلی اور لکھنؤ کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد زبان و بیان کے سوا، اندازِ بیاں، مزاج و ماحول،

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

پلاٹ، ساخت، نفسِ مضمون، واقعات کی ترتیب، ہیتِ ترکیبی، فضا، آغاز، وسطانیہ اور انجام کے لحاظ سے ایک جیسا قرار دیا گیا ہے۔ نواب مرزا شوقؔ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شوقؔ کا تعلق اگرچہ دبستانِ لکھنؤ سے ہے اور اُن کی غزلوں میں لکھنوی رنگ ملتا ہے، لیکن اُن کی منظوم مثنویاں اندازِ بیاں کے لحاظ سے دہلوی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اور ان میں مومنؔ و اثرؔ دہلوی کا تقلیدی رنگ جھلکتا ہے۔[۴۰] اس بارے میں ڈاکٹر گیان چند کی اس رائے سے اتفاق کیا گیا ہے کہ مثنوی کے باب میں دبستانِ دلّی اور دبستان اودھ کی تفریق اس قدر واضح نہیں ہے، جتنی کہ غزلوں کے معاملے میں ہے۔[۴۱] مزید برآں دکن کی مثنویوں کی طرح دہلی اور لکھنؤ کی منظوم مثنویوں پر فارسی مثنویوں کی تقلید کے رنگ کی بابت تجزیہ کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ ان میں بھی فارسی مثنوی کے تمام لوازم کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا، بلکہ ان میں سے زیادہ تر فارسی سے ترجمہ ہیں۔ باب کے آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ اُردو کے منظوم قصّے، خواہ ان کا تعلق دہلی سے ہو یا لکھنؤ سے صرف موضوع کے لحاظ ہی سے نہیں، بلکہ صورت میں بھی ایک جیسے ہیں اور سب کے سب مثنوی کی شکل میں ملتے ہیں۔ مزید یہ کہ منظوم قصّوں کے بیان کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی صنف نہیں تھی، اس لیے اُردو کے تمام قصّے، جو مشہور و مقبول ہوئے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں، جو اس کے سوا کسی اور رُوپ میں ہو۔[۴۲]

اگلے چار ابواب، باب پنجم تا ہشتم منظوم داستانوں کو ''شخصی منظوم داستانیں یا آپ بیتیاں''، ''غیر شخصی مختصر عشقیہ منظوم داستانیں''، ''غیر زبانوں سے ماخوذ داستانیں'' اور ''بعض طویل اور اہم منظوم داستانیں'' کے موضوعات کے تحت زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ پانچویں باب ''شخصی منظوم داستانیں یا آپ بیتیاں'' میں اُن منظوم قصّوں کا جائزہ لیا گیا ہے، جن میں مختلف شعرا نے اپنی سرگزشت بیان کی، اُن میں جعفر علی خاں زکیؔ، فضائل علی خاں بے قیدؔ، میرؔ، انشا، مومنؔ، نواب مرزا شوقؔ اور واجد علی شاہ اخترؔ کے آپ بیتی نما منظوم قصّے شامل ہیں۔ سوداؔ کی ''قصّہ عشقِ پسر شیشہ گر بہ زرگر پسر''، میرؔ کی ''معاملاتِ عشق''، ''جوشِ عشق'' اور ''خواب و خیال''، انشا کی ''شکایت نامہ'' یا ''احوال عاشق خود'' مومنؔ کی ''شکایتِ ستم''، ''قصۂ غم''، ''قولِ غمیں''، ''تفِ آتشیں''، ''حنینِ مغموم'' اور ''آہ و زاریِ مظلوم''، نواب مرزا شوقؔ کی ''فریبِ عشق''، ''بہارِ عشق'' اور ''زہرِ عشق''، اور واجد علی شاہ اختر کی ''عشق نامہ'' اور ''حزنِ اختر'' کا تجزیہ کر کے ان کے فکری و فنی محاسن و معائب کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری آپ بیتی کو قصّہ، کہانی کی اوّلین صورت اور مستقبل کی کہانیوں کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ اُنھیں اس بات کا احساس ہے کہ اُردو میں ایسے قصّوں کی تعداد بہت کم ہے، لیکن وہ اس ذخیرے کو وقیع اور اہم سمجھتے ہیں، کیوں کہ ان کی وجہ سے نئی راہیں کھلیں، بہت سارے ادبی اُمور میں قیاس آرائیوں کا خاتمہ ہوا اور اصلیت سامنے آئی۔ یہ قصّے شعرا کی شخصیت، ماحول، کلام اور مزاج کو سمجھنے میں معاون ثابت ہونے کے ساتھ فنی محاسن کی بنا پر ادبی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سرمائے میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔[۴۳] اس پہلو پر بھی بحث کی گئی ہے کہ ان منظوم داستانوں کا عموماً نہ پلاٹ ہے اور نہ ہی واقعات میں تنوع و تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہ کرداروں کی کثرت سے بھی عاری ہیں اور نہ ان میں فوق الفطرت عناصر کے اعجوبہ روزگار کارنامے ہیں اور نہ ہی مہمات و حادثات کی ہنگامہ خیزی ہے۔ ان میں سے بیش تر منظوم داستانیں اکہرے پلاٹ کے مختصر واقعات ہیں، جن میں شاعر افسانوں کے انداز میں اپنی سرگزشت سنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان اس قسم کے منظوم قصّوں کا رواج دکنی عہد سے بتاتے ہیں اور شمالی ہند میں جعفر علی خاں زکی کو پہلا شاعر قرار دیتے ہیں، جن کے ہاں منظوم آپ بیتی کا سراغ ملتا ہے۔ اُن کی اس مثنوی کو نایاب کہتے ہوئے اس کی ابتدا کے پانچ شعر نقل کیے ہیں۔[۴۴] مثنوی کا نام نہیں بتایا گیا اور نہ ہی نقل کیے گئے اشعار کا ماخذ بتایا ہے۔ فضائل علی خاں بے قیدؔ کی داستانِ عشق بہ شکل مثنوی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مثنوی کو ناپید کہہ کر میر حسنؔ کا ایک بیان مع اشعار نقل کر کے بتایا گیا ہے کہ اس میں سو سے زیادہ اشعار تھے۔ تقریباً دو صفحات پر محیط اس اقتباس کے ماخذ کا پتا دینا بھول گئے ہیں، لیکن امکان غالب یہ ہے کہ یہ اقتباس میر حسنؔ کی ''تذکرۃ الشعرا'' سے لیا گیا ہے۔

سوداؔ کی افسانوی مثنوی ''قصّہ عشقِ پسر شیشہ گر بہ زرگر پسر'' کو زیر بحث لاتے ہوئے اس کے دو حصّے بتائے گئے ہیں۔ پہلے کو شخصی آپ بیتی اور دوسرے کو جگ بیتی کہتے ہوئے اصل داستان قرار دیا گیا ہے اور اس باب میں اس کے پہلے قصّے کو زیر بحث لانا ضروری سمجھا ہے۔ یہاں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تمہیدی حصّے کو داستان سے الگ قرار دے کر اس کے بعد کے حصّے کو کس کلیے کے تحت اصل داستان قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ ہر مثنوی کا تمہیدی حصّہ بہر طور کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے اور ایسی کوئی قید نہیں کہ مثنوی نگار تمہید کس طرح باندھے۔ اس لیے سوداؔ کے اس منظوم قصّے کو اگلے باب ''غیر شخصی مختصر عشقیہ منظوم داستانیں'' میں رکھ کر تجزیہ کیا جانا چاہیے تھا۔ ''شخصی داستانوں'' اور ''غیر شخصی داستانوں'' کی اصطلاح بھی سمجھ سے باہر ہے۔ اس لیے کہ ہر قصّہ یا داستان کوئی نہ کوئی شخص ہی بیان کرتا ہے پھر داستان کو شخصی یا غیر شخصی کیوں کہا جائے؟ ڈاکٹر فرمان کے ذہن میں ''آپ بیتی منظوم داستانیں'' اور ''جگ بیتی منظوم داستانیں'' تھا، اس لیے ان ابواب کے عنوان ''آپ بیتی نما منظوم داستانیں'' اور ''مختصر عشقیہ منظوم داستانیں'' ہو سکتے تھے، جیسا کہ ان سے اگلے دو ابواب میں شخصی یا غیر شخصی کی تفریق کے بغیر عنوان ''غیر زبانوں سے ماخوذ داستانیں'' اور ''بعض طویل اور اہم منظوم داستانیں'' رکھے گئے ہیں۔

سوداؔ کے معاصرین میں میرؔ کو پہلا شخص قرار دیا گیا ہے، جو اپنی حیاتِ معاشقہ کو تین مثنویوں ''معاملاتِ عشق''، ''جوشِ عشق'' اور مثنوی ''خواب و خیال'' کی شکل میں نظم کر کے مکمل منظوم آپ بیتی افسانوں کی فنی حیثیت سے کامیاب صورت سامنے لائے۔ ڈاکٹر فرمان نے میرؔ کی تینوں مثنویوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ ان میں نظم کیے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

گئے واقعات میرؔ کی عشق کی مختلف چوٹوں سے نہیں، بلکہ ایک ہی چوٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو باہم ملا دینے سے میرؔ کی منظوم آپ بیتی سامنے آتی ہے۔ میرؔ کی ان عشقیہ مثنویوں کے پس منظر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے میرؔ کے عشق کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے، اور اس کا سرا یہ کہتے ہوئے کہ ''آثار و قرائن کی مدد سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ میرؔ کے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزوؔ کی بیٹی تھیں۔''(۴۵) خان آرزوؔ کی بیٹی سے جوڑ دیا ہے۔ آگے لکھتے ہیں: ''میرؔ کے معاشقے کا آغاز اکبر آباد میں نہیں بلکہ دلّی میں ہوا ہوگا۔''(۴۶) آرزوؔ کے دہلی میں مقیم ہونے کا بتا کر لکھتے ہیں: ''میرؔ کا ان کے ہاں ضرور آنا جانا رہا ہوگا۔''(۴۷) پھر لکھتے ہیں کہ: ''اس لیے گمان ہوتا ہے کہ جوانی پہلے پہل دلّی ہی میں دیوانے پن کا شکار ہوئی ہوگی۔''(۴۸) مزید لکھتے ہیں کہ: ''۱۷۳۹ء ہی میں دلّی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ نفسی نفسی کی پکار ہوئی۔ دلّی خالی ہونے لگی۔ غالباً سراج الدین علی خاں آرزوؔ نے بھی بیوی بچوں کو اپنے وطن اکبر آباد بھیج دیا۔''(۴۹) ان بیانات میں ''کہا جا سکتا ہے۔''، ''ہوا ہوگا۔''، ''رہا ہوگا۔''، ''گمان ہوتا ہے۔''، ''ہوئی ہوگی'' اور ''غالباً'' کے الفاظ قیاس آرائیوں پر دلیل دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے میرؔ کے معاشقے کے آغاز کا مقام دہلی کہا ہے اور آرزوؔ کے بیوی بچوں کی آگرہ منتقلی کو بھی ''غالباً'' کہہ کر لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فرمان نے اس معاملے میں یقین کی بجائے قیاس آرائیوں پر بھروسہ کیا ہے۔ جہاں تک میرؔ کے عشق کو آرزوؔ کی صاحبزادی سے جوڑنے کا تعلق ہے، اُنھوں نے آرزوؔ کی طرف سے میرؔ کو گھر سے نکالنے کا سبب اس عشق کو قرار دیا ہے۔ حالاں کہ گھر سے بے دخل کرنے کے پیچھے وہ بدگمانی تھی، جو خود میرؔ کے سوتیلے بھائی کے خط کے بعد آرزوؔ کے دل میں پیدا ہوئی۔ مزید ڈاکٹر فرمان اس معاملے میں ابہام کا شکار ہیں، کیوں کہ وہ شک کے ساتھ اس عشق کا آغاز میرؔ کے پہلے سفرِ دلّی کو کہتے ہیں اور شک کے ساتھ ہی ۱۷۳۹ء میں آرزوؔ کے خاندان کی آگرہ منتقلی کی بات کرتے ہیں اور میرؔ کی دلّی سے آگرہ جانے کی وجہ حالات کے ساتھ محبوبہ کے وہاں جانے کو قرار دیتے ہیں، لیکن اس کے بعد خاموش ہو جاتے ہیں کہ آرزوؔ کے بیوی بچے آگرہ ہی میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں یا واپس دلّی جاتے ہیں۔ آرزوؔ کے خاندان کے متعلق کچھ نہیں بتاتے، تاہم میرؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''وہ چار و ناچار دلّی واپس آ گئے، اس بار دلّی میں چوں کہ کوئی سہارا نہ تھا اس لیے اپنے ماموں سراج الدین خاں آرزوؔ کے ہاں قیام کیا، لیکن جب آرزوؔ کے حقیقی بھانجے حافظ محمد حسین [کذا] نے اکبر آباد میں میر کی حرکتوں کا کچا چٹھا لکھا اور اُنھیں ایک خط میں ''فتنۂ روزگار'' قرار دیا تو آرزو نے بڑی خوش سلیقگی سے میرؔ کو اپنے گھر سے نکال دیا۔''(۵۰) بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو میرؔ کے پہلے سفرِ دلّی کے بعد وہاں قیام کے دوران کہتے ہیں کہ جوانی پہلے پہل دلّی ہی میں دیوانے پن کا شکار ہوئی ہوگی۔ اور دوسری جانب دوسرے سفرِ دلّی کے بعد کے دَور کو عشق و عاشقی کا دَور کہتے ہیں۔ درج ذیل بیان ملاحظہ ہو:

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

صمصام الدولہ نادر شاہ کے حملے میں مارے گئے اور میر کو اپنے وطن اکبر آباد واپس آنا پڑا۔ وہاں کوئی یار و مددگار نہ نظر آیا تو اسی سال دوبارہ دلّی واپس آئے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے ہاں قیام کیا۔ یہیں اُنھوں نے میر جعفر نامی ایک شخص سے تعلیم حاصل کی اور سعادت امروہوی اور خان آرزوؔ کی صحبتوں کے زیرِ اثر شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ اسی زمانے میں اُن کی عشق و عاشقی کا سلسلہ شروع ہوا۔(۵۱)

میرؔ کے عشق کی بابت ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ:

غالباً اُن کے عشق کا واقعہ دلّی آنے سے قبل اکبر آباد میں ظہور پذیر ہو چکا تھا اور یہ بات اُن کے عزیزوں کو اچھی نہیں لگی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے اُن پر سختی کو روا رکھا۔(۵۲)

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اگرچہ یقین کی بجائے ''غالباً'' کا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن یہ بیان اس لیے درست ہو سکتا ہے کہ امیر الامرا صمصام الدولہ کی وفات (۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء) کے بعد میرؔ دہلی سے آگرہ واپس آ گئے تھے اور آگرہ میں روزگار نہ ملنے پر دوبارہ ۱۱۵۲ھ میں دلّی پہنچے اور آرزوؔ کے ہاں قیام پذیر ہوئے، لیکن چوں کہ اُن کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے اپنے خط بنام آرزوؔ، میں میرؔ کو فتنہ قرار دیا تھا، اس لیے میرؔ کو آرزوؔ کے گھر سے نکلنا پڑا۔ گمان غالب یہی ہے کہ میرؔ کے آگرہ میں عشق کا راز طشت از بام ہونے کی بنا پر ہی اُن کے سوتیلے بھائی اور آرزوؔ کے بھانجے نے آرزوؔ کو خط لکھ کر میرؔ کے فتنے سے آگاہ کیا، جس کی وجہ سے آرزوؔ نے اپنے گھر کے دروازے میرؔ پر بند کر دیے۔ ڈاکٹر فرمان اپنی تصنیف ''میرؔ کو سمجھنے کے لیے'' میں ''مطالعۂ میرؔ کے بنیادی ماخذ'' کے عنوان سے شامل مضمون میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے مرتبہ و مترجمہ ''ذکرِ میر''، ایڈیشن دوم، ۱۹۹۶ء، انجمن ترقی اُردو (ہند) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''اُنھوں [ڈاکٹر نثار احمد فاروقی] نے لکھا ہے کہ 'حاصل کلام یہ ہے کہ میرؔ، جب خان آرزوؔ کے ساتھ رہ رہے تھے تو اُنھوں نے خان آرزوؔ کے گھر یا خاندان میں کسی لڑکی سے عشق کیا اور نہایت شد و مد سے کیا۔''(۵۳)

محمد بن علی باوہاب لکھتے ہیں کہ: ''قرین قیاس بھی ہے کہ میر پہلی دفعہ بھی جب دہلی گئے ہیں، تو آرزو کے ہاں فروکش رہے یا ان کے ہاں میر کی آمدورفت رہی۔ اسی دوران وہ جوان ہوئے۔ آرزو کی صاحبزادی سے عشق لڑاتے رہے۔ عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ خوبرو بھی تھے۔''(۵۴)

انشا کے منظوم افسانے، جو بعض کلیات میں ''شکایت نامہ'' اور بعض میں ''احوالِ عاشق خود'' کے نام سے شامل ہیں، کا تجزیہ کرتے ہوئے فنی محاسن و معائب پر روشنی ڈالی ہے۔ اسے ایک مختصر عشقیہ واقعہ کہا گیا ہے، جس میں عاشق یا محبوبہ کے کردار و شخصیت میں کوئی نمایاں خوبی نظر نہیں آتی اور نہ ہی غم و فراق کا بیان کوئی تاثر چھوڑتا ہے۔ اسے منظوم

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

آپ بیتیوں میں پائی جانے والی کشش اور اثر انگیزی سے خالی قرار دیا گیا ہے اور اس کی وجہ انشاء اللہ خاں کی زندگی کے بعض دیگر معاملات کی طرح محبت کے معاملات میں غیر سنجیدہ طرزِ عمل قرار دیتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ بہت ممکن ہے ان کا معاشقہ بھی اسی نوعیت کا رہا ہو اور محض دل لگی ہو۔

ڈاکٹر فرمان انشا کی مثنوی کے یہ اشعار نقل کرتے ہیں:

حقیقت کی نہ پوچھو بعد چندے
ملا ان نے دیا تھا جس کے بندے
ہوا تھا پر میسّر وصل دلخواہ
ملاقاتیں ہوا کیں تا بہ یک ماہ(۵۵)

ان اشعار کے بارے میں ڈاکٹر فرمان رائے دیتے ہیں کہ کسی راز دار نے عاشق و محبوبہ میں صلح صفائی کرا دی اور دونوں خاطر خواہ ملاقات کا لُطف اُٹھانے لگے۔ یہاں ''یک ماہ'' کے ''وصل دلخواہ'' کو ''جنسی لذت کشی'' قرار نہیں دیا گیا، جس طرح میرؔ کے اس طرز کے اشعار پر قرار دیا گیا اور یہاں محض ''ملاقات کا لُطف اُٹھانے'' کا کہہ کر بات آگے بڑھا دی گئی ہے۔ میرؔ کے اس طرز کے نقل کیے گئے اشعار ملاحظہ ہوں:

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط
ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط
تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب
جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب
ایک دن ہم وے متصل بیٹھے
اپنے دلخواہ دونوں مل بیٹھے
شوق کا سب کیا قبول ہوا
یعنی مقصودِ دل حصول ہوا
واسطے جس کے تھا میں آوارہ
ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ(۵۶)

ان اشعار کے نقل کرنے سے پہلے ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں: ''لیکن کوئی احتیاط و مصلحت کام نہ آئی اور محبوبہ نے آخر کار خود کو میرؔ کی آغوش میں دے دیا۔(۵۷) اور ان اشعار کے نقل کرنے کے بعد کا تجزیہ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں کہ: ''جنسی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

لذت کشی و عیش کوشی کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ آفت نا گہانی آئی۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دلّی پر حملہ کیا۔ دلّی تباہ ہوگئی۔''(۵۸) انشا اور میرؔ کے اشعار میں عشقیہ خیالات و کیفیات کے اظہار میں خاص فرق نہیں، لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دونوں جگہ جو تجزیہ کیا ہے، اس میں فرق البتہ واضح نظر آتا ہے۔

مومنؔ کی مثنویوں ''شکایتِ ستم''، قصۂ غم''، ''قولِ غمیں''، ''تُفِ آتشیں'' اور ''حنینِ مغموم'' کی شخصی قصّوں کے حوالے سے تاریخی اہمیت، ان میں قصّے کی تفصیلات اور شعری محاسن نیز ان قصّوں کی میرؔ کے عشقیہ قصّوں سے مشابہت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مومنؔ کے ہاں عاشقانہ جذبات و معاملات کی کیفیات، اثرات، حُسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ اور عاشق و معشوق کی آپس میں نوک جھونک کے بیان میں پائے جانے والے تنوع کو مومنؔ کا ایسا خاصہ قرار دیا گیا ہے، جو مثنویاتِ میرؔ میں بھی نظر نہیں آتا۔ مومنؔ کی مثنویوں کا میرؔ کی مثنویوں سے موازنہ کرتے ہوئے بعض حقائق کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ کیوں کہ ان دونوں کے عشق، حالات و واقعاتِ زندگی اور طرزِ زندگی میں واضح فرق ہے۔ میرؔ نوعمری میں صرف ایک ''پری تمثال'' کی زُلفوں کے اسیر ہوئے اور اس عشق میں ناکامی کے روگ کو گلے لگا لیا اور مجنوں ہو گئے، علاج معالجے تک کی نوبت آئی۔ قریبی رشتوں اور دوست احباب کی بے رُخی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہی درد و غم اُن کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ مومنؔ کو عشق کا چرکا بچپن ہی سے لگا، جب اُن کی عمر ابھی نو برس تھی اور ڈاکٹر فرمان کے مطابق مومنؔ نے کسی ایک کی بجائے کئی پردہ نشینوں سے دل لگایا۔ میرؔ کا سلسلۂ تعشق مختصر عرصے کا تھا، جب کہ مومن کے معاشقوں کا سلسلہ ۱۲۳۱ء سے ۱۲۴۶ء سولہ سال تک جاری رہا۔(۵۹)

کچھ واقعات اور بیانات کا مناسب محاکمہ نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے ان سے اتفاق کرنا مشکل ہے، مثلاً ''شکایتِ ستم'' کا خلاصہ رقم کرنے سے پہلے لکھتے ہیں کہ ''مومن نو سال کی عمر ہی میں ایک ماہرو پر فریفتہ ہو چکے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی دلدادگی و دلداری کا دم بھرتے تھے اور باہم راز و نیاز میں مصروف رہتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ان کی عشق بازی کا شہرہ ہونے لگا۔''(۶۰) مزید لکھتے ہیں کہ ''نتیجتاً دونوں محتاط ہو گئے اور دو سال تک ملنے جلنے کا موقع نہ مل سکا، اتفاقاً مومن کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں مومن کی محبوبہ بھی مہمان کی حیثیت سے آ گئی۔ دونوں کو باہم ملنے اور شکوہ و شکایت کا موقع میسر آیا لیکن دو ہی دن بعد محبوبہ کو واپس ہونا پڑا۔ دونوں کو جدائی بڑی شاق گزری۔ محبوبہ کچھ ایسی کمزور دل اور جذباتی تھی کہ غم فراق کی تاب نہ لا سکی اور چند دنوں بعد اسی غم میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔''(۶۱) یہاں نو سال کے کم عمر لڑکے کے عشق کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جس لڑکی سے اسے عشق ہوا اُس کی عمر بھی اتنی ہو گی۔ اتنی کم عمر بچی کے لیے ''ماہرو'' کے الفاظ درست نہیں لگتے۔ اس عمر میں عشق کے معنوں سے ہی آگاہ ہونا مشکل ہے۔ پھر نو سال کا لڑکا اور اسی عمر کی لڑکی آپس میں ایسے کون سے ''راز و نیاز'' میں مصروف رہے کہ ''عشق بازی'' کا ''شہرہ'' ہونے لگا؟ دو

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سال بعد ہونے والی دو دن کی ملاقات میں ایسی کس قسم کی محبت لاحق ہوگئی کہ لڑکی جدائی کی تاب نہ لا کر ''چند دنوں بعد'' ہی چل بسی؟ یہ باتیں حقیقت کے خلاف دکھائی دیتی ہیں۔ مومنؔ نے ضرور مثنوی گوئی کا فائدہ اُٹھایا ہے، جس میں حقیقت کے بیان کے ساتھ زیبِ داستان کے لیے کچھ غیر حقیقی واقعات کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مومنؔ کی مثنویوں کے پس منظر کے حوالے سے بحث کی ہے اور مومنؔ کے مختلف عشقیہ معاملوں کو ان مثنویوں کے ذریعے سامنے لائے ہیں۔ مثنویوں سے اشعار نقل کیے ہیں اور ان کی ادبی، فنی، سوانحی اور تاریخی حیثیت تسلیم کی ہے۔

نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان مثنویوں کو مختصر، مگر حقیقت اور رُومان سے بھرپور قرار دیتے ہیں۔ ان میں مومنؔ کی آپ بیتی منظوم داستانوں اور میر اثرؔ کی ''خواب و خیال'' کا رنگ تلاش کرتے ہیں، تاہم انھیں کسی قسم کے تقلیدی رنگ سے پاک کہتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق شوقؔ کے ہاں فلسفیانہ نکتے اور مروّجہ افسانوی عناصر کے نہ ہونے کے باوجود شوقؔ کی مثنویوں میں محاورے کی صفائی، قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی پائی جاتی ہے۔ شوقؔ کو پہلا شخص قرار دیا گیا ہے، جس نے لکھنوی طرزِ شاعری سے بغاوت کرتے ہوئے حقیقت پسندانہ، سادہ اور دردانگیز اُسلوبِ شعر کی بنیاد ڈالی۔[۶۲] عطاء اللہ پالوی کے ''تذکرۂ شوقؔ'' کے حوالے سے، جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ شوقؔ کی مثنویوں سے قبل واجد علی شاہ کی مثنوی ''بحرِ الفت'' اور بادشاہ محل صاحبہ کی مثنوی ''جان عالم'' وجود میں آچکی تھیں، ڈاکٹر فرمان کا کہنا ہے کہ شوقؔ کی مثنویاں ''فریبِ عشق''، ''بہارِ عشق'' اور ''زہرِ عشق'' ان سے پہلے لکھی گئیں۔[۶۳] تاہم شوقؔ کی مثنوی ''فریبِ عشق'' کو واجد علی شاہ کی مثنوی ''بحر الفت'' پر زمانی تقدم دینا کہ یہ واجد کی تخت نشینی سے پہلے لکھی گئی اور اس بارے میں ٹھوس شواہد کی عدم فراہمی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دعوے کو کمزور بناتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ واجد علی شاہ نے ''بحر الفت'' تخت نشین ہونے کے بعد لکھی ہو۔ ڈاکٹر گیان چند نے واجد کی داستانوی مثنویوں کو اُن کی ولی عہدی کے زمانے کی تصنیف کہا ہے، بلکہ ''بحر الفت'' اور ''بہارِ عشق'' سے اشعار نقل کرتے ہوئے ''بہارِ عشق'' کے اشعار کو ''بحرِ الفت'' سے ماخوذ بتایا ہے۔[۶۴] اس بارے میں رشید حسن خاں کی یہ رائے متوازن ہے کہ: ''اب تک یہ بات بحث طلب اور تحقیق طلب ہے کہ واجد علی شاہ نے یہ مثنوی [بحرِ الفت] کب لکھی تھی، بہارِ عشق سے پہلے یا اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ میری نظر سے ضرور گزرا ہے، لیکن میری رائے میں یہ بحث اب نا تمام ہے۔ جب تک اس مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے متعلق کوئی واضح رائے نہ قائم کی جا سکے، اس وقت تک اخذ و استفادے کی بابت بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''[۶۵]

ڈاکٹر فرمان ''فریبِ عشق'' کو شوقؔ کی پہلی مثنوی قرار دیتے ہوئے اس کا سنہِ تصنیف واجد علی شاہ کی تخت نشینی ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء سے قبل کا کہتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ مثنوی چوں کہ واجد علی شاہ کی مدح کے بغیر لکھی گئی اس

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

لیے اس کا سنہِ تصنیف اُن کی تخت نشینی سے قبل کا ہوگا۔ ''بہارِ عشق'' میں چوں کہ واجد علی شاہ کی مدح تھی، اس لیے اسے اُن کے دورِ حکومت ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۱۷ء تا ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء کے درمیان کی لکھی گئی تصنیف کہتے ہیں۔ ''زہرِ عشق'' میں مدحِ واجد علی شاہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اسے اُن کے دَورِ حکومت کے خاتمے ۱۲۶۳ھ/۱۸۵۶ء کے بعد کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان مثنویوں کے سن تصنیف کے سلسلے میں عطاء اللہ پالوی سے مکمل اتفاق کرتے ہیں اور ''تذکرۂ شوقؔ'' سے یہ اقتباس نقل کرتے ہیں، ''میری رائے یہ ہے کہ شوق لکھنوی کی سب سے پہلی مثنوی فریب عشق ہے جو ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۶ء اور ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء کے درمیان لکھی گئی۔ بہارِ عشق دوسری مثنوی ہے جو ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶ء اور ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء کے درمیان لکھی گئی ہے اور زہرِ عشق سب سے آخری تصنیف ہے جو ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء اور ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء کے درمیان لکھی گئی ہے۔''(۶۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تذکرۂ شوق کے مصنّف کی اس رائے کو مدلل قرار دیا ہے اور سنہِ تصنیف کی بحث کو یہیں چھوڑ دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے مصنف ''تذکرۂ شوق'' کی درج ذیل رائے کو قیاس قرار دیا ہے: ''فریب عشق میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد ''مدحِ سلطان'' نہیں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء سے پہلے کی تصنیف ہے اور اس تصنیف کے وقت شوقؔ نے ضرورت نہ سمجھی کہ وہ خواہ مخواہ بادشاہ کی مدح سرائی کریں۔''(۶۷) رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ، ''قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شوقؔ کی پہلی تصنیف ہوسکتی ہے۔ سنہِ تصنیف کا تعیّن نہیں کیا جا سکتا اور قطعیّت کے ساتھ زمانۂ تصنیف کا بھی تعیّن نہیں کیا جا سکتا۔''(۶۸) ''بہارِ عشق'' کے معاملے میں رشید حسن خاں نے ڈاکٹر گیان چند کی رائے کو قرینِ قیاس قرار دیا ہے جس کے مطابق اس کا سنہِ تصنیف ۱۲۶۶ھ کہا ہے۔(۶۹) زہرِ عشق کے بارے میں رشید حسن خان کا کہنا ہے کہ زہرِ عشق میں کوئی ایسی صراحت نہیں، جس کی مدد سے اس کے سنہِ تصنیف یا زمانۂ تصنیف کا تعیّن کیا جا سکے۔ اس کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ جنوری ۱۸۶۲ء کا ملتا ہے اس لیے قطعی طور پر صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۷۷ھ [۶۱-۱۸۶۰ء] ہو۔(۷۰) ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس حوالے سے بھی بحث کی ہے کہ شوقؔ کی مثنویاں اُن کی آپ بیتی ہیں یا کہ اُنھوں نے دوسروں کے عشقیہ قصّوں کو نظم کیا ہے۔اس حوالے سے وہ حالیؔ کا یہ بیان ''شوقؔ نے مثنویوں میں اپنی بوالہوسی اور کام جوئی کی سرگزشت بیان کی ہے یا یوں کہو کہ اپنے اوپر افترا باندھا ہے۔'' نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس کا مفہوم یہ ہے کہ حالیؔ شوق ہی کو ان کی مثنویات کا ہیرو خیال کرتے ہیں۔''(۷۱) وہ خواجہ احمد فاروقی کے اس بیان کہ ''شوق نے آپ بیتی کا رنگ اختیار کر کے قصّے کو اتنا اصل بنا دیا ہے کہ ہمیں واقعے کا شبہہ ہونے لگتا ہے۔''(۷۲) کو مبہم قرار دیتے ہیں۔ اس بحث کے بعد ڈاکٹر فرمان ان مثنویوں کا ہیرو شوقؔ کو قرار دیتے ہوئے ان میں نظم عشقیہ داستانوں کو شوقؔ کی آپ بیتیاں قرار دیتے ہیں۔ داستانی مثنوی کا ہیرو ہونا ایک الگ

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

معاملہ ہے اور اس داستان کے قصّے میں آپ بیتی کا بیان الگ معاملہ ہے۔ڈاکٹر فرمان نے ان دونوں معاملات کو ملا جلا کر پیش کرتے ہوئے شوقؔ کی مثنویوں کو ان کی آپ بیتیاں قرار دے دیا ہے۔حالاں کہ اوپر حالیؔ کے بیان کہ ''اپنے اوپر افترا باندھا ہے'' اور خواجہ احمد فاروقی کے بیان کہ ''آپ بیتی کا رنگ اختیار کر کے قصّے کو اتنا اصل بنا دیا ہے کہ ہمیں واقعے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوقؔ نے اپنے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے، لیکن یہ اُن کی آپ بیتیاں نہیں ہیں۔رشید حسن خاں کا تجزیہ ہے کہ:

> بہارِ عشق، فریبِ عشق اور زہرِ عشق؛ تینوں مثنویوں میں شوقؔ نے ایک ہی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے کہ اپنے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے اور پوری کہانی اس طرح سنائی جیسے آپ بیتی ہو۔یہ بیان کا ایک خاص انداز ہے۔اس طرح کہانی میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہوسکتا ہے اور سننے والوں پر زیادہ اچھا اور گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔اس پیرایۂ بیان کو حقیقت بیانی پر محمول کرنا اور سچ مچ اسے بیان کرنے والے کی آپ بیتی سمجھ لینا، اندازِ بیان کے اسرار و رموز سے نا آشنائی کا اعلان کرتا ہے۔(۷۳)

ڈاکٹر گیان چند رقم طراز ہیں کہ: ''فریبِ عشق اور بہارِ عشق میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ شوقؔ کا تجربہ نہ سہی کسی اور کا ہوگا، اس عہد کے لکھنؤ میں ایسے واقعات ضرور ہوتے ہوں گے۔زہرِ عشق کا انجام اتنا نا معقول ہے کہ وہ کسی کی سرگزشت نہیں ہوسکتی۔''(۷۴) واجد علی شاہ اخترؔ کی مثنویوں ''عشق نامہ'' اور ''حزنِ اختر'' کے حوالے سے مختصر بحث کی گئی ہے۔ ''عشق نامہ'' کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ ڈاکٹر فرمان کی نظر سے نہیں گزرا۔عبدالحلیم شررؔ کا ''مقدمۂ حزنِ اختر'' (۱۹۲۲ء) اُن کے پیشِ نظر رہا ہے۔اس مثنوی کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ اس پر واقعیت و تاریخ کا رنگ اتنا گہرا اور بیان کچھ ایسا بے ربط ہے کہ اسے تاریخی نظم یا منظوم واقعہ تو کہا جا سکتا ہے، لیکن منظوم قصّہ خیال کرنا مشکل ہے۔(۷۵) اس کے ساتھ مولوی عبدالحق کی رائے سے اتفاق کیا ہے کہ نظم سیدھی سادی اور لکھنؤ کی شاعری کے مروجہ تکلّفات سے پاک ہے اور اس میں دلی جذبات اور حالات کو بے تکلّفانہ بیان کیا گیا ہے۔(۷۶) یہاں تجزیے میں تضاد نظر آتا ہے۔ایک طرف تو اسے منظوم قصّہ تسلیم کرنے سے انکاری ہیں اور دوسری جانب مولوی عبدالحق کی مثنوی کے بارے میں مثبت رائے سے اتفاق ظاہر کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں غیر شخصی مختصر منظوم داستانوں کے عنوان سے داستانوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔سوداؔ کی ''قصہ در عشق پسر شیشہ گر بہ زرگر پسر'' کا شمالی ہندوستان کی پہلی منظوم داستان کے طور پر تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔قصّے کے خلاصے کے بعد چند آخری اشعار نقل کرتے ہوئے مثنوی کو مربوط اور مسلسل قرار دیا گیا ہے، جس میں جزئیات و تفصیل عمدگی سے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

موجود ہے۔ میرؔ کی ''شعلہ عشق''، ''جوان وعروس''، ''مور نامہ''، ''حکایت عشق'' اور ''اعجاز عشق پر'' بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان ان قصّوں کی خصوصیات کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کی نمایاں خصوصیت ان کی اصلیت و واقعیت اور رُومانی فضا قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان قصّوں میں عموماً پلاٹ کا ارتقا نہیں ہوتا، قصّہ در قصّہ کی خصوصیت بھی نہیں ملتی، البتہ کسی خاص واقعے کو قصّے کے طرز میں بیان کرنے اور عشق ولوازم عشق کے بیان کا فن دکھائی دیتا ہے۔ وصل وہم آغوشی کے بیان کے باوجود عریانی اور فحش نگاری کا دخل نظر نہیں آتا۔ ان مثنویوں کی ایک خصوصیت ان کے ابتدائی اشعارِ عشق کو قرار دیا گیا ہے۔ یہاں ''شعلہ عشق'' کے اصل نام کے بارے میں ذکر نہیں ملتا، جس کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ''شعلۂ عشق'' کا اصل نام ''شعلۂ شوق'' تھا۔ وہ فورٹ ولیم کالج کے مطبوعہ ''کلیات میر'' کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس میں شعلۂ شوق درج ہے۔[۷۷] ڈاکٹر گیان چند نے اس حوالے سے بحث کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس مثنوی کا نام کہیں شعلۂ عشق ملتا ہے، تو کہیں شعلۂ شوق۔ وہ میرؔ کے دیوان کے قدیم ترین نسخے، نسخۂ حیدرآباد کے حوالے سے اس کا نام شعلۂ شوق لکھتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کے حوالے سے بھی یہی نام بتاتے ہیں اور رام پور کے نسخۂ کلیات میرؔ کے حوالے سے بھی یہی نام لکھتے ہیں۔[۷۸] ڈاکٹر فرمان ''حکایتِ عشق'' کے تجزیے میں اسے ایک کمزور پلاٹ کا ایسا قصّہ قرار دیتے ہیں، جو دردانگیز تو ہے، لیکن دل چسپی سے خالی ہے۔ ہیروئن، جو کہ شادی شدہ ہندو خاتون ہے، کی شوہر پرستی کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسے قرینے سے پیش کیا گیا ہے، لیکن اگر دیکھا جائے تو کہانی کا ہیرو جوافغان پسر ہے اور اپنی پُرکاری و پرہیزگاری کے لیے مشہور ہے، اُسے ایک غیر مذہب کی شادی شدہ خاتون کے عشق میں مبتلا دکھایا گیا ہے، جو اس طرح کے کردار کے حامل شخص پر موزوں دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاکٹر گیان چند کا تجزیہ ہے کہ ''میرؔ کی مثنویوں میں معشوق کے انتقال کے بعد عاشق بھی جان دے دیتا ہے اور بعد میں عجب پُراسرار طریقے سے دونوں کی لاشوں کا وصال ہو جاتا ہے۔ مثنوی کی تمام واردات فطری ہیں، صرف خاتمے کو غیر فطری بنا دینا قصّہ نویسی کی خامی ہے۔''[۷۹]

سودا اور میرؔ کے منظوم قصّوں کے بعد مرزا جان بیگ سامی کے ''سروشمشاد''، مصحفیؔ کے گلزار شہادت اور جذبہ عشق، میر محمد حیات حسرت، ملقب بہ ہیبت خاں کے طوطی نامہ، جرأت کے حسن وعشق، کارستان اُلفت، راجا وچیری، مرزا علی لطف کی مثنوی عشقیہ یا نیرنگ عشق، قائم کے جذبۂ الفت یا عروس و درویش، سیف اللہ کے منظوم قصّے چندر بدن ومہیار، نظیر اکبرآبادی کے انسان و پری، بسمل فیض آبادی کے حسن وعشق، ذوالفقار علی خاں صنعا لکھنوی کی مثنوی چھومنتر، حضرت شاہ آیت اللہ جوہری کے گوہر جوہری، راسخ عظیم آبادی کے اعجاز عشق، کشش عشق، نیرنگ محبت، حسن وعشق اور جذبۂ عشق، سعادت یار خاں رنگین کے نیرنگ رنگیں، اور مثنوی بدھو گل فروش، قاضی محمد صادق کی سراپا سوز، نور علی نور کے مہر و وفا، آغا حسن امانت لکھنوی کے اندر سبھا، منیر شکوہ آبادی کے حجاب زناں، واجد علی شاہ کے فسانۂ عشق، دریائے تعشق، اور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

بحر اُلفت، آغا حسن نظم کے لذّت عشق، شاہ فرزند علی منیری کے کشش عشق، روش عشق، امیر اللہ تسلیم کے شام غریباں، منشی عطا اللہ خاک کے گلدستۂ مسرت، علی کے سعد و سلمیٰ اور منشی انوار حسین کے قمر و زہرہ پر بحث کی گئی ہے۔ان قصّوں کے پلاٹ، کرداروں اور فضا کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ منظوم قصّے اکہرے پلاٹ کے مختصر افسانے ہیں، جن میں نہ تو قصّے کی طوالت ہے، نہ کرداروں کی کثرت اور نہ ہی ان کی فضا دوسری طویل داستانوں کی طرح طلسم انگیز ہے، لیکن ان میں واقعات کی سادگی اور سچائی پائی جاتی ہے۔ دلائل و استدلال کے ساتھ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان منظوم قصّوں میں قدیم غزل کا سا سوز و گداز ملتا ہے اور مقامی آب و رنگ دکھائی دیتا ہے اور یہ کہ ان کی بنیاد عشق کے فطری جذبات پر رکھی گئی ہے۔

ساتویں باب میں غیر زبانوں سے ماخوذ داستانیں اور منظوم ترجمے زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ ان میں پنجابی قصّے ''سسی پنوں'' کی مثنوی کی صورت میں منظوم داستان ''اسرارِ محبت''، ملک محمد جائسی کی تصنیف ''پدماوت'' کے اُردو تراجم، ''رامائن'' کے اُردو تراجم، انشاء اللہ خاں کے منظوم قصّے ''رانی کیتکی کی کہانی''، ہندی داستان ''نل و دمن'' کے اُردو تراجم، غنیمتؔ کی مثنوی ''نیرنگِ عشق'' کا ترجمہ، ''نگارستانِ الفت'' کے اُردو تراجم، عربی الاصل افسانے ''لیلیٰ مجنوں'' کے تراجم، عنایت اللہ کی فارسی تصنیف ''بہارِ دانش'' کا اُردو ترجمہ، فارسی کی نثری داستان ''آرائشِ محفل و قصہ حاتم طائی'' کا اُردو ترجمہ، ''ہفت سیر حاتم''، ''قصۂ چہار درویش'' کے اُردو منظوم تراجم، ''قصۂ خسروانِ عجم''، قصۂ بہرام گور''، ''ہیر رانجھا''، ''فسانۂ عجائب''، ''الف لیلہ منظوم''، ''سنگھاسن بتیسی''، ''افسانۂ غم'' اور ''فسانۂ گوپی چند'' کے منظوم اُردو تراجم شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان نے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور پنجابی زبانوں سے ماخوذ ان مثنویوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ یہ مثنویاں اصل زبانوں کی نظموں کے ہم پلہ نہ ہونے کے باوجود اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان زبانوں کو نہ جاننے والا اُردو طبقہ بھی ان سے لُطف اُٹھا سکتا ہے اور پھر یہ کہ ان مثنویوں کے ذریعے اُردو شاعری کا دامن موضوع اور اُسلوب کے اعتبار سے وسیع ہوا۔

اگلے باب میں طویل منظوم داستانوں ''دریائے عشق''، ''بحر المحبت''، ''سحر البیان''، ''مہ جبین و نازنین''، ''گلزارِ نسیم'' اور ''طلسم الفت'' کو فنی و ادبی نقطۂ نظر سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ میرؔ کی ''دریائے عشق'' کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے اُس دور کی سماجی و معاشرتی زندگی کی عکاس، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، واقعات کے تسلسل، اندازِ بیان اور مافوق الفطرت قوتوں کی عمدگی سے شمولیت کے لحاظ سے میرؔ کے تمام قصّوں سے بہتر قرار دیا ہے۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی رائے کہ یہ قصّہ فارسی مثنوی ''قضا و قدر'' سے ماخوذ ہے اور اس پر خواجہ احمد فاروقی کی رائے جس کے تحت اُنھوں نے ''قضا و قدر'' کو ''دریائے عشق'' سے کم تر درجے کی مثنوی کہا، کا حوالہ پیش کرنے کے ساتھ ڈاکٹر فرمان کا کہنا ہے کہ فارسی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مثنوی کے علاوہ قدیم اُردو میں ''چندر بدن مہیار'' مصنفہ مقیمیؔ اور ''طالب و موہنی'' مصنفہ والہؔ، پلاٹ اور نتیجے کے اعتبار سے ''دریاے عشق'' کے مماثل ہیں۔(۸۰) مصحفیؔ کی ''بحر المحبت'' کے اشعار کی تعداد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ۳۷۸ لکھی ہے۔ مصنفہ ''مطالعۂ مثنویات مصحفیؔ'' نے ڈاکٹر گیان چند کے حوالے سے تعداد ۳۷۸ لکھی ہے، جب کہ کتب خانۂ مشرقیہ کے دیوان پنجم قلمی کے حوالے سے ۳۴۶ اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی، جنھوں نے اس مثنوی کو ۱۹۲۳ء میں اضافے اور تصحیح کے ساتھ مطبع معارف اعظم گڑھ کو شائع کرایا، کے مقدمے کا حوالہ دیتے ہوئے اشعار کی تعداد ۳۶۰ درج کی ہے اور مولانا کے حوالے سے ہی زمانۂ تصنیف ۱۲۲۵ء سے پہلے کا بتایا ہے۔(۸۱) ''دریاے عشق'' اور ''بحر المحبت'' کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مصحفیؔ نے ''دریاے عشق'' کے قصّے میں بعض جگہ مزید رنگ بھرنے کا دعویٰ کیا ہے اور بلا شبہ بعض جگہ کامیاب بھی ہوئے ہیں، لیکن ''بحر المحبت'' کو ''دریاے عشق'' سے بہتر خیال کرنا درست نہیں۔(۸۲) مزید کہتے ہیں کہ میرؔ نے ''بحر المحبت'' میں فارسی تراکیب کا بہت کم استعمال کیا ہے اور قصّہ گوئی کی زبان کو پیش نظر رکھا ہے، جب کہ مصحفیؔ نے ''دریاے عشق'' میں کثرت سے فارسی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے اشعار گنجلک اور مبہم ہو کر دشوار ہو گئے ہیں اور اس انداز بیان اور فارسی آمیز زبان سے داستان کی روانی اور سلاست ختم ہو گئی ہے۔(۸۳) ڈاکٹر سعیدہ وارثی کی رائے درست ہے کہ:

> مصحفیؔ کی مثنوی بحر المحبت ہو یا ہجو خانہ، کسی میں ہمیں کوئی ترقی نہیں ملتی۔ اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ میرؔ نے اُردو مثنوی کو جس حد تک آگے بڑھا دیا تھا مصحفیؔ اس سے دو قدم بھی اپنی مثنویوں کو آگے نہ لے جا سکے۔(۸۴)

میر حسنؔ کی شہزادہ بے نظیر و بدر منیر کی طویل منظوم داستان ''سحر البیان'' کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے اس سے پہلے اور بعد کی منظوم داستانوں کے تناظر میں اس کے فکری و فنی پہلوؤں کو سامنے لایا گیا ہے اور خاص طور پر پنڈت شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' سے موازنہ کرتے ہوئے ان دونوں مثنویوں کی خصوصیات اور فنی محاسن کو بیان کرنے کے بعد قرار دیا گیا ہے کہ اُردو میں کوئی ایسی مختصر یا طویل منظوم داستان نہیں ملتی، جسے ''سحر البیان'' پر ترجیح دی جا سکے، البتہ مثنوی ''گلزارِ نسیم'' بعض فنی محاسن کی بنا پر ایسی مثنوی کہی جا سکتی ہے کہ جب ''سحر البیان'' کا ذکر ہو، تو اس کا نام ساتھ ذہن میں آ جاتا ہے یا ''گلزارِ نسیم'' کے نام کے ساتھ ''سحر البیان'' کی طرف ذہن خود بخود چلا جاتا ہے۔(۸۵) ان دونوں مثنویوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مختلف آرا بھی پیش کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش کی رائے ہے کہ ''اگر فن کے اعتبار سے اُردو کی بہترین مثنوی ''سحر البیان'' ہے، تو صناعی اور لطف بیان کے اعتبار سے مثنوی ''گلزارِ نسیم'' بے مثل ہے۔''(۸۶)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر فرمان کا سعادت یار خاں رنگین کے قصّہ ''مہ جبین و ناز نین'' کے بارے میں کہنا ہے کہ یہ ''مثنوی دلپذیر'' کے نام سے مشہور ہے۔سعادت یار خاں رنگینؔ کی مہ جبین و ناز نین کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صابر علی خان کے تحقیقی مقالے سے استفادہ کیا گیا اور اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔(۸۷) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تصنیف ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' سے بھی حوالے دیے گئے ہیں،جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری دلائل و استدلال میں محققانہ کاوشوں کو سامنے رکھتے ہیں۔صاحبِ ''سعادت یار خاں رنگینؔ'' نے مثنوی ''مہ جبین و ناز نین'' کے اشعار کی تعداد ۱۸۶۵ لکھی ہے۔(۸۸) پنڈت دیا شنکر نسیم کی ''گلزار نسیم کے'' ماخذ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔نہال چند لاہوری کے اُردو نثری قصّے کو عزت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف کا اُردو ترجمہ قرار دینے کی روایتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔گل بکاؤلی کے قصّے کے بارے میں گارسیں دتاسی کے بیان کہ توپ خانہ لکھنؤ میں اس قصے کے متعلق ایک قدیم دکنی قصّہ بھی ملتا ہے کو بنیاد بنا کر قرار دیا گیا ہے کہ ''اگر ہم گارساں دتاسی کے بیان کو درست مان لیں،تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گل بکاؤلی کا قصّہ ابتداً دکنی میں لکھا گیا اور اس کے بعد عزت اللہ بنگالی نے اسے فارسی میں ترجمہ کیا۔''(۸۹) گارسیں دتاسی کے اس دعوے کے حق میں اور بیانات بھی ملتے ہیں،جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔مثلاً ڈاکٹر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں گل بکاؤلی کے بارے میں درج ذیل عبارت کا حوالہ دیا جا سکتا ہے:

> *Gul-e-Bakauli*: A love story of Taj-ul-Maluk and Bukauali, translated from Hindustani into Persian ca. 1134/1722 by Izzatullah Bengali.(90)

اس بارے میں دوسرا بیان یہ ملتا ہے:

> *Madhubi Ishq*: The Hindustani version of the story of Prince Tajul Maluk, the fairy Bakawali and her rose, which was orginally written in Hindi translated into Persian by Shaikh Izzatullah Bengali.(91)

دیا شنکر نسیم کے دعوے کہ اس سے پہلے بکاؤلی کا قصّہ نظم میں موجود نہ تھا، سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔مختلف مقالہ نگاروں کے نتیجے کہ نسیم نے ریحان کی اُردو اور رفعتؔ کی فارسی مثنوی دونوں سے استفادہ کیا ہے، پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے دلائل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ رفعتؔ نے نسیم سے استفادہ کیا، جب کہ ریحان کی اُردو مثنوی گلزار نسیم سے قبل لکھے جانے کے باوجود ادبی محاسن و کمالات شاعرانہ کے لحاظ سے مرتبے میں گلزار نسیم کو نہیں پہنچتی۔(۹۲) ''گلزارِ نسیم'' کی تلخیص کے بعد اس کے فنی و فکری محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ڈاکٹر فرمان کا کہنا ہے کہ ''گلزارِ نسیم'' لکھنوی دبستان کی پہلی طویل منظوم داستان ہے،جس میں مثنوی اور قصّے دونوں کے لوازم پائے جاتے ہیں۔اس میں کردار نگاری، واقعات و جذبات کی مصوری، تسلسل بیان اور روانی کی کم و بیش وہی صفات و محاسن موجود ہیں، جو منظوم داستانوں کے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

لیے عام طور پر ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ ''گلزارِنسیم'' کی دل کشی اور حُسن کا راز اس کی رنگین بیانی، معنی آفرینی، اختصار نویسی، کنایاتی اُسلوب، تشبیہہ و استعارے کی طرفگی اور لفظی صناعی کو قرار دیتے ہیں۔ بعض کرداروں کی ترجمانی کو شخصیت نگاری کے اُصولوں کے منافی قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان نے نشان دہی کی ہے۔ داستان کے آغاز میں زین الملوک کے چاروں بیٹوں کو ذہین و ذکی بتایا گیا ہے، لیکن ان کے کردار اور اعمال قصّے میں آگے چل کر اس کو جھٹلاتے ہیں۔(۹۳) ڈاکٹر فرمان کے بعض بیانات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ''گلزارِنسیم'' کے ہیرو تاج الملوک کے کردار کو عام انسانی فطرت سے جدا قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ہیرو کا کردار تو بعض وجوہ سے انسانی ہوتے ہوئے بھی عام انسانی فطرت سے جداگانہ ہے۔ اُس میں حرکت ہے، وفاداری ہے، عشق و محبت کا جذبہ ہے، باپ سے، ماں سے اور بھائیوں سے محبت ہے اور مصائب کو برداشت کرنے کی قوت ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک مثالی کردار ہے جس میں نیکیوں کے سوا کوئی برائی نہیں ہے۔ اُس کی فطرت میں غصہ اور نفرت کے عناصر بالکل نہیں ہیں، اُس کے بھائی اس کے ساتھ کیا کیا ظلم کرتے ہیں لیکن نہ تو وہ اُن سے خفگی کا اظہار کرتا ہے، اور نہ کبھی اُن سے انتقام لینے کی سوچتا ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اُن کی مدد کرتا ہے۔ یہ چیز عام انسانی فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور اسی لیے تاج الملوک کا کردار بہت سی خوبیوں کا حامل ہوتے ہوئے بھی ہمارے لیے کچھ زیادہ دل چسپ نہیں رہتا۔(۹۴)

حالاں کہ تاج الملوک کی بعض انسانی فطرتوں کے بارے میں مذکورہ بالا رائے سے پہلے ڈاکٹر فرمان خود لکھ چکے ہیں کہ: ''بکاؤلی تاج الملک کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے اور چوری چھپے اس کی صحبتوں کا لطف اُٹھاتی ہے۔''(۹۵) ''بکاؤلی تاج الملوک کے ساتھ گرم اختلاط ہے۔''(۹۶) ''تاج الملوک اس [بکاؤلی] کی تلاش میں سرگرداں و پریشان ہے۔''(۹۷) ''اُسے [تاج الملوک] کو شرارت سوجھتی ہے اور وہ پریوں کی پوشاک اُٹھا لیتا ہے۔''(۹۸) ڈاکٹر فرمان مثنوی کے ہیرو میں تمام انسانی فطرتوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں، جب کہ ہیرو یا ہیروئن کا کردار اور صفات عام انسانی کرداروں سے مختلف ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرمان رعایت لفظی کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رعایتِ لفظی بذاتِ خود کوئی عیب نہیں ہے۔ اظہارِ خیال اور شاعرانہ اظہارِ خیال میں وہ اسے ضروری قرار دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جہاں صرف الفاظ کی رعایت مقصود ہو اور معنی معدوم ہوں، وہاں رعایتِ لفظی بدترین عیب ہوتی ہے اور ''گلزارِنسیم'' میں بھی ایسی مثالیں موجود

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ہیں، لیکن نسیم نے اسے اس طرح برتا ہے کہ کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اسے بالالتزام ملحوظ رکھا گیا ہے۔[۹۹] رشید حسن خان ''گلزارِ نسیم'' میں رعایتِ لفظی پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس مثنوی میں رعایتِ لفظی کے باوجود معائب نسبتاً کم ہیں۔ وہ اس کی بڑی وجہ اس کے اختصار کو قرار دیتے ہیں۔[۱۰۰] رشید حسن خان کا کہنا ہے کہ:

> رعایتِ لفظی کا التزام بے حد عجیب چیز ہے، ذرا سی بد سلیقگی سے یہ سب سے بڑا عیب بن جاتا ہے۔ مثال میں پورے کے پورے دیوان پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بہت سے زیور لاد دینا دولت مندی کے ساتھ ساتھ گنوار پن کی پہچان بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات کسی جھجھک کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ نسیمؔ نے بڑی مہارت اور سلیقے کے ساتھ اس جن کو اشعار کے شیشے میں اتارا ہے۔ اُردو میں کوئی دوسری اتنی طویل نظم شاید ہی پیش کی جا سکے جس میں چند مقامات کو چھوڑ کر رعایتِ لفظی سے اشعار میں ایسی پہلو داری پیدا کی گئی ہو اور حسنِ بیان کی نزاکت کو کم سے کم ٹھیس پہنچی ہو۔[۱۰۱]

ڈاکٹر عبدالقیوم کی رائے ہے کہ: ''بلاشبہ مثنوی گلزارِ نسیم ایک مخصوص رنگ کی حامل ہے۔ اختصار اس کا سب سے بڑا وصف ہے لیکن قصے کا تسلسل اس قدر وضاحت ضرور چاہتا ہے کہ اس میں درمیان میں بے ربطی نمایاں نہ ہونے پائے اور ہر جگہ ایک واضح کیفیت نمایاں ہو۔ لفظی مناسبتیں اور صنعتیں اس رنگ کو چمکنے نہیں دیتیں۔''[۱۰۲]

آفتاب الدولہ قلقؔ کی منظوم داستان ''طلسم اُلفت'' کا اُردو کی طویل ترین منظوم داستان کے طور پر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ عبدالقادر سروری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، امیر احمد علوی کی آرا نقل کرنے کے بعد ان سے اتفاق کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ دبستان لکھنؤ کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ''گلزارِ نسیم'' کی طرح ''طلسم اُلفت'' کی اہمیت مسلم ہے، لیکن یہ الگ بات ہے کہ بعض کمزوریوں کے سبب وہ فنی حیثیت سے ''گلزار نسیم'' یا ''زہر عشق'' کے بلند مرتبے کو نہ پہنچ سکی۔[۱۰۳] ''طلسم اُلفت'' پر مولانا حالیؔ کے تنقیدی تجزیے کو ڈاکٹر فرمان نے اُن کی شاعری کے قومی و ملّی اصلاح کے نظریے کے تناظر میں پرکھا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے تنقیدی خیالات کا بھی محاکمہ کیا ہے اور ان دونوں کی آرا سے بڑی حد تک اتفاق کرتے ہوئے بہت ساری کمزوریوں کے باوجود ''طلسم اُلفت'' کو ادبی محاسن سے عاری خیال کرنے کو درست قرار نہیں دیتے۔[۱۰۴] مولانا حالیؔ کے تجزیے کہ ''طلسم اُلفت'' کا سب سے بڑا عیب کلام کا اقتضاے حال کے مطابق بیان نہ ہونا اور واقعات کی نیچرل تصویر کشی نہ ہونا ہے، پر ڈاکٹر فرمان نے مثنوی میں سے اجزا نقل کر کے واضح کیا ہے کہ ہر جگہ ایسا معاملہ نہیں ہے اور اس مثنوی میں جذبات و واقعات کی سچّی تصویریں نظر آتی ہیں۔

مقالے کے آخری باب نہم، جو دس صفحات پر مشتمل ہے، میں منظوم داستانوں کے آغاز و ارتقا اور زوال کے عہد کا

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مختصراً احاطہ شعری ادب کی قدیم ترین صنف کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ دُنیا کی مختلف زبانوں کے ادب کی منظوم داستانوں کی روایت کا ایک مقبول صنف کے لحاظ سے اجمالی جائزہ لیتے ہوئے منظوم داستانوں کی اہمیت وضرورت، ان کے موضوعات، مواد اور کردار و ہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹرفرمان فتح پوری کے خیالات کو اس عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے۔لکھتے ہیں کہ:

> جب انسانوں کا اوّلین گروہ معاشی ضرورتوں سے مجبور ہوکر منتشر ہوا تو اپنے ساتھ بعض مشترک روایات بھی ساتھ لے گیا۔ ان روایات میں دیوی، دیوتاؤں کے گیت اور نیم مذہبی طلسماتی کہانیاں قدیم ترین ہیں اور دراصل انھیں کی منظوم اور ترقی یافتہ صورتوں کا دوسرا نام منظوم داستان ہے۔زمان و مکان کے ہزاروں سال کے بُعد نے جہاں ایک علاقے کے لوگوں کو بلحاظ زبان، وضع قطع، ضروریات زندگی اور رہن سہن، دوسرے علاقے سے مختلف کر دیا وہاں ان کی مذہبی روایتوں، اعتقادوں اور شجاعت وعشق کے افسانوں میں بھی نمایاں فرق پیدا کر دیا۔ورنہ منظوم داستانیں مشرق کی ہوں یا مغرب کی، قدیم یونان کی ہوں یا برصغیر پاک و ہند کی،اپنی ساخت، مزاج، مافوقِ فطرت عناصر، جنسی کشش، شجاعت ومحبت، طلسمی ماحول، اور ہیرو پرستی کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی ساری قوموں اور ملکوں میں منظوم داستان کی روایت عام وخاص دونوں میں ہمیشہ سے مقبول رہی ہے۔(۱۰۵)

اُردو میں منظوم داستانوں کی روایت کا خلاصہ برصغیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کے پسِ منظر میں دہراتے ہوئے ان کی کلاسیکل حیثیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ''دریاے عشق''، ''شعلۂ عشق''، ''بحرالمحبت''، ''سحر البیان''، ''گلزارِنسیم''، ''زہرِعشق''، ''بہارِعشق'' اور ''قولِ غمیں'' کو ایسی نظموں کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جن کی شاعرانہ عظمت و اہمیت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ پروفیسرسحر انصاری کا کہنا درست ہے کہ ڈاکٹرفرمان فتح پوری نے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے ''اُردو کی منظوم داستانیں'' کا موضوع منتخب کیا، اور اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کر دیا۔(۱۰۶)
ڈاکٹراے بی اشرف، ڈاکٹرفرمان کے اس مقالے کی افادیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> بحیثیت مجموعی پوری کتاب تحقیق وتنقید کا بہترین امتزاج پیش کرتی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے حتی الامکان تمام اصل ماخذات تک پہنچنے کی پوری کوشش کی ہے۔ بہت سی غیر مطبوعہ داستانوں تک رسائی حاصل کی ہے۔نئی دریافتوں تک پہنچے ہیں اور اس صنف کے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مطالعے میں کئی اضافے کئے ہیں۔یوں یہ تصنیف ایک اوریجنل تحقیقی کتاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔فاضل محقق کے تنقیدی نظریات بڑے متوازن اور جچے تلے ہوتے ہیں۔کہیں بھی انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوتے۔لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی تنقیدی آرا کا اظہار کرتے ہیں۔ادب کو سیاسی، سماجی پس منظر میں پرکھتے ہیں لیکن اس کی فنی حیثیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔چناں چہ جہاں ان منظوم داستانوں کے سماجی اور معاشرتی اثرات کا ذکر کرتے ہیں وہاں ان کی فنی خوبیوں اور خامیوں کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔(۱۰۷)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا اُردو منظوم داستانوں پر یہ تحقیقی و تنقیدی تجزیہ اُن کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔اس تحقیقی مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اُنھوں نے اُردو اور انگریزی کی کئی کتابوں کو کھنگالا۔بنیادی ماخذات کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کی اور کئی غیر مطبوعہ داستانوں تک رسائی حاصل کی اور بنیادی ماخذ کے طور پر اُردو کی منظوم داستانوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔اس مقالے کے ذریعے اُردو کی منظوم داستانوں کے حوالے سے کئی اضافے ہوئے۔اُسلوبِ بیان کے اعتبار سے مقالہ تحقیق نگاری کی معیاری زبان کے مطابق لکھا گیا ہے۔مقالے میں شستہ، قابل فہم اور سنجیدہ زبان استعمال کی گئی ہے۔مجموعی طور پر فن مقالہ نگاری کو ملحوظِ خاطر کیا گیا ہے۔دیباچے میں موضوع کی اہمیت اور مقاصد تحقیق کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔مقالے کو ابواب میں تقسیم کر کے ابواب وار مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔سب سے پہلے موضوع کا پس منظر بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد کے ابواب کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم کر کے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ابواب میں زیرِ بحث منظوم داستانوں کی فہرست، باب کے آغاز میں نہ دیے جانے کی وجہ سے بعض اوقات اُلجھن محسوس ہوتی ہے۔ابواب میں منظوم داستانوں پر بحث کا طریق کار یکساں دکھائی نہیں دیتا۔کسی باب میں منظوم داستانوں کو موضوع عنوان بنایا گیا ہے اور کسی باب میں شعرا کے حوالے سے منظوم قصّوں پر بحث کی گئی ہے۔حوالے اور حواشی ہر باب کے آخر میں دیے گئے ہیں۔کتابیات مقالے کے آخر میں دی گئی ہے۔

مقالے میں سنین کے اندراج کا یکساں طریقہ نہیں اپنایا گیا۔کہیں ہجری و عیسوی دونوں سنین، کہیں صرف ہجری اور کہیں صرف عیسوی سنین دیے گئے ہیں۔بعض مقامات پر سنین درج کرنے میں سہو بھی واقع ہوا ہے۔مثلاً لکھتے ہیں کہ: ''میرؔ کی عمر ابھی مشکل سے دس سال تھی کہ اوائل ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں اُن کے والد کی وفات ہوگئی۔''(۱۰۸) یہاں عیسوی سنہ ۱۷۳۲ء کی بجائے ۱۷۲۲ء درج کر دیا گیا ہے۔مومنؔ کی مثنوی ''شکایت ستم'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ پہلی مثنوی ''شکایت ستم'' (۱۳۳۱ھ) کے دوسرے معاشقے کا تاثر معلوم ہوتی ہے۔''(۱۰۹) یہاں بھی درست سنہ ۱۲۳۱ھ کی بجائے ۱۳۳۱ھ دے دیا گیا ہے۔کچھ اغلاط کتابت کی وجہ سے ہوسکتی ہیں۔جیسے جرأت کی مثنوی ''حسن و

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

عشق'' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''دونوں شعروں کے مصرعوں سے ۹۲۔۱۱۹۱ء نکلتے ہیں۔''[۱۱۰] اس جملے میں ہجری سن کی بجائے عیسوی سن ظاہر کر دیا گیا ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ: ''قصہ 'گل بکاؤلی' ابتداً فارسی میں تھا اور اسے ۱۱۳۴ھ میں عزت اللہ بنگالی نے اپنے ایک دوست نذر محمد کی علالت کے زمانے میں اس کا دل بہلانے کے لیے ترتیب دیا تھا۔'' ڈاکٹر فرمان نے یہاں سن ۱۱۳۴ھ دیا ہے، جب نذر محمد علیل تھے، جب کہ تحقیق کے مطابق نذر محمد کا انتقال ۱۱۲۴ء میں ہوا۔[۱۱۱] بعض تسامحات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً میرؔ کے سوتیلے بھائی اور خان آرزوؔ کے حقیقی بھانجے کا نام حافظ محمد حسین لکھتے ہیں۔[۱۱۲] کتابت کی غلطی سمجھی جا سکتی تھی، لیکن اگلے صفحے پر تواتر سے تین بار یہی نام دہرایا گیا ہے۔ حالاں کہ اصل نام حافظ محمد حسن ہے۔[۱۱۳] ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ: ''میرؔ کی قریبی عزیز فخر الدین خاں کی بیوہ نے ان کے لیے دعا تعویذ جھاڑ پھونک سب کچھ کروایا۔''[۱۱۴] یہ میرؔ کی قریبی عزیز کی بیوہ نہیں، بلکہ میرؔ کے والد کی مرید بیگم فخر الدین خاں تھیں، جنھوں نے کافی روپیا پیسا خرچ کر کے میرؔ کا علاج کروایا۔[۱۱۵] کچھ مقامات پر حوالہ جات کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ ''محمد ہادی کامور خان نے بہت صحیح لکھا ہے کہ: 'اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ آشیانے میں چغد آباد ہیں اور بلبل کی جگہ زاغ نے لے لی ہے۔''[۱۱۶] لیکن حوالہ نہیں ملتا کہ یہ عبارت کہاں سے لی ہے۔ فکری اور فنی لحاظ سے ڈاکٹر فرمان کے مقالے ''اُردو کی منظوم داستانیں'' کا شمار اُردو کے اہم مقالوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس مقالے میں اُردو کی منظوم داستانوں کی ابتدا، ان کے ارتقا، ان کی تاریخی و سماجی اہمیت اور ان کے زوال کے اسباب پر دلائل و شواہد کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہ مقالہ اُردو زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والوں، طلبہ اور محققین کو کارآمد معلومات بہم پہنچاتا ہے۔

حواشی

۱۔ عبدالقادر سروری، ''اُردو مثنوی کا ارتقا''، (حیدر آباد دکن: ادارۂ ادبیات اُردو، ۱۹۴۰ء)، ص، ج۔
۲۔ ڈاکٹر محمد اقبال جاوید، ''دکنی اردو کی منظوم داستانیں''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، (جام شورو: سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۷۷ء)، ص اول۔ دوم۔
۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ''اُردو کی منظوم داستانیں''، (کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء)، اشاعت دوم، ص ۱۵۔
۴۔ ایضاً، ص ۱۶۔
۵۔ ڈاکٹر فرمان، ''تنقیدی شذرات و مقالات''، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۔
۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایک جہت نما صاحبِ قلم''، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۲۱۔
۷۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۶۶۔۶۵۔
۸۔ ایضاً، ص ۶۷۔
۹۔ ایضاً، ص ۶۷۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۶۹۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۱۔ پروفیسر خان رشید، ''اُردو کی تین مثنویاں (سحر البیان، قطب مشتری، گلزار نسیم)''، (دہلی: چمن بکڈپو، ۱۹۸۶ء، طبع اوّل، ص ۸۔

۱۲۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۴۷

۱۳۔ ڈاکٹر گیان چند، ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''، جلد دوم، (نئی دلّی: انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۶۹ء)، اشاعت دوم، ص ۱۱۹

۱۴۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۴۷

۱۵۔ ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''، ص ۱۱۹

۱۶۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ''ڈاکٹر جمیل جالبی : تاریخ ادب اُردو''، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی'' مرتبین ڈاکٹر سیّد عامر سہیل و نسیم عباس احمر، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۰۷۔

۱۷۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۷۶۔

۱۸۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ''ڈاکٹر جمیل جالبی : تاریخ ادب اُردو''، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، ۲۰۱۰ء، ص ۴۰۸۔

۱۹۔ اُردو کی منظوم داستانیں، ص ۹۰۔

۲۰۔ ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۵۴۔

۲۱۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۸۱

۲۲۔ ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۵۴۔

۲۳۔ ڈاکٹر شیراز زیدی، ''ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: علمی و ادبی خدمات''، (کراچی: سعید پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۱۲۔

۲۴۔ ''دکنی اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۹۱

۲۵۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۹۸۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۹۹۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۳۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ''ولی سے اقبال تک''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۳۵۔

۳۲۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۱۱۲۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۲۴۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔۱۲۴۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۴۱۔ ایضاً،ص ۱۲۶۔
۴۲۔ ایضاً،ص ۱۲۷۔
۴۳۔ ایضاً،ص ۱۳۱۔
۴۴۔ ایضاً، ۱۳۲۔
۴۵۔ایضاً،ص: ۱۴۵۔
۴۶۔ ایضاً،ص ۱۴۵۔
۴۷۔ایضاً،ص ۱۴۵۔
۴۸۔ ایضاً،ص ۱۴۵۔
۴۹۔ ایضاً،ص ۱۴۵۔
۵۰۔ ایضاً،ص ۱۴۶۔
۵۱۔ ایضاً،ص ۱۴۳۔
۵۲۔ ڈاکٹرعبادت بریلوی،''میر تقی میرؔ''،(لاہور: ادارۂ ادب وتنقید، ۱۹۸۰ء)،ص ۱۶۔
۵۳۔ ڈاکٹرفرمان فتح پوری،''میرؔ کو سمجھنے کے لیے''،(لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)،ص ۲۸۔
۵۴۔ محمد بن علی باوہاب،''محمد تقی میرؔ کی خودنوشت ذکر میرؔ کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''،(کراچی: یونائیٹڈ بک کارپوریشن، ۱۹۹۷ء)،ص ۲۵۳۔
۵۵۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۱۶۰۔
۵۶۔ ایضاً،ص ۱۵۰۔
۵۷۔ ایضاً،ص ۱۵۰۔
۵۸۔ ایضاً،ص ۱۵۱۔
۵۹۔ایضاً،ص ۱۷۲۔
۶۰۔ ایضاً،ص ۱۸۱۔
۶۱۔ ایضاً،ص ۱۸۱۔
۶۲۔ ایضاً،ص ۱۹۷۔
۶۳۔ ایضاً،ص ۱۹۸۔
۶۴۔ رشید حسن خاں،مرتب،''مثنویات شوقؔ (فریبِ عشق، بہارِ عشق، زہرِ عشق)''،(کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۹ء)،ص ۱۱۸۔
۶۵۔ایضاً،ص ۱۱۹۔
۶۶۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۲۰۱۔۲۰۰۔
۶۷۔ ''مثنویات شوقؔ''،ص ۳۱۔۳۰۔
۶۸۔ ایضاً،ص ۳۵۔
۶۹۔ ایضاً،ص ۳۷۔
۷۰۔ ایضاً،ص ۵۷۔
۷۱۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۲۰۱۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۷۲۔ ایضاً،ص ۲۰۱۔
۷۳۔ ''مثنویاتِ شوق''،ص ۱۲۷۔
۷۴۔ ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''،ص ۵۱۷۔
۷۵۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۲۴۳۔
۷۶۔ ایضاً،ص ۲۴۳۔
۷۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،''تاریخ ادب اُردو''،جلد دوم،حصہ اوّل،(دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء)،ص ۶۲۳۔
۷۸۔ ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''،ص ۲۲۲۔
۷۹۔ ایضاً،ص ۸۰۔
۸۰۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۴۵۷۔
۸۱۔ ڈاکٹر سعیدہ وارثی،''مطالعۂ مثنویاتِ مصحفیؔ''،(نئی دہلی:تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۵ء)،ص ۷۱۔
۸۲۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۴۸۶۔
۸۳۔ ایضاً،ص ۴۸۸۔
۸۴۔''مطالعہ مثنویاتِ مصحفیؔ''،ص ۸۷۔
۸۵۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۴۸۹۔
۸۶۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش،''داستانیں''،(اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء)،ص ۲۵۳۔
۸۷۔ اُردو کی منظوم داستانیں،ص ۵۵۷۔
۸۸۔ ڈاکٹر صابر علی خاں،''سعادت یار خاں رنگینؔ''،(کراچی:انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۵۶ء)،ص ۱۱۶۔
۸۹۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۵۶۹۔
۹۰۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم،''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات''،(کراچی:سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۴ء)،ص ۱۳۱۔
۹۱۔ ایضاً،ص ۱۳۱۔
۹۲۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۵۸۴۔
۹۳۔ ایضاً،ص ۶۱۵۔
۹۴۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''،ص ۶۱۰۔
۹۵۔ایضاً،ص ۶۰۷
۹۶۔ایضاً،ص ۶۰۷
۹۷۔ ایضاً،ص ۶۰۸
۹۸۔ایضاً،ص ۶۰۹
۹۹۔ ایضاً،ص ۶۱۸۔
۱۰۰۔ رشید حسن خان،مرتب،''مثنوی گلزارِ نسیم''،دیا شنکر نسیم لکھنوی،(نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء)،ص ۹۔
۱۰۱۔ ایضاً،ص ۷۔
۱۰۲۔ ڈاکٹر عبدالقیوم،''حالی کی اُردو کی نثر نگاری''،طبع دوم،(لاہور:مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۱۲ء)،ص ۳۵۹۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۰۳۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۶۲۸۔
۱۰۴۔ ایضاً، ص ۶۵۲۔
۱۰۵۔ ایضاً، ص ۶۷۰۔
۱۰۶۔ پروفیسر سحر انصاری، ''ڈاکٹر فرمان کچھ یادیں کچھ باتیں'' مشمولہ ''نگار پاکستان''، کراچی، ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری نمبر''، جولائی۔اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۱۔
۱۰۷۔ ڈاکٹر اے بی اشرف، ''داستان شناسی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری'' مشمولہ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: احوال و آثار''، مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۶۔
۱۰۸۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۱۴۲۔
۱۰۹۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔
۱۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹۷۔
۱۱۱۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات''، طبع دوم، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۴ء)، طبع دوم، ص ۱۳۳۔
۱۱۲۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۱۵۳۔
۱۱۳۔ قاضی عبدالودود، ''میر کے حالاتِ زندگی''، مشمولہ ''میر تقی میر، میر شناسی: منتخب مضامین'' مرتبین ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء)، ص: ۲۱۔
۱۱۴۔ ''اُردو کی منظوم منظوم داستانیں''، ص ۱۱۵۔
۱۱۵۔ قاضی عبدالودود، ''میر کے حالات زندگی''، مشمولہ ''میر تقی میر، میر شناسی: منتخب مضامین''، ص ۲۸۔
۱۱۶۔ ''اُردو کی منظوم داستانیں''، ص ۱۱۰۔

مآخذ

۱۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایک جہت نما صاحبِ قلم''، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۲۱
۲۔ باوہاب، محمد بن علی، ''محمد تقی میرؔ کی خودنوشت ذکر میرؔ کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''، (کراچی: یونائیٹڈ بک کارپوریشن، ۱۹۹۷ء)، ص ۲۵۳
۳۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، ''میر تقی میرؔ''، (لاہور: ادارۂ ادب وتنقید، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۶
۴۔ بخش، سلطانہ، ڈاکٹر، ''داستانیں''، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء)، ص ۲۵۳
۵۔ بیگم، عبیدہ، ڈاکٹر، ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات''، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۳۱
۶۔ بیگم، عبیدہ، ڈاکٹر، ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات''، طبع دوم، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۴ء)، طبع دوم، ص ۱۳۳
۷۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اُردو''، جلد دوم، حصہ اوّل، (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء)، ص ۶۲۳
۸۔ جاوید، محمد اقبال، ڈاکٹر، ''دکنی اردو کی منظوم داستانیں''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، (جام شورو: سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۷۷ء)، ص اول۔دوم
۹۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''، جلد دوم، (نئی دلّی: انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۶۹ء)، اشاعت دوم، ص ۱۱۹
۱۰۔ _____، ''ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اُردو''، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی'' مرتبین ڈاکٹر سیّد عامر سہیل و نسیم عباس احمر، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء)، ص ۴۰۷

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۱۔ خاں، رشید حسن، مرتب، ''مثنویاتِ شوقؔ (فریبِ عشق، بہارِ عشق، زہرِ عشق)''، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۱۸

۱۲۔ _____، مرتب، ''مثنوی گلزارِ نسیم''، دیا شنکر نسیم لکھنوی، (نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء)، ص ۹

۱۳۔ خاں، صابر علی، ڈاکٹر، ''سعادت یار خاں رنگینؔ''، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۵۶ء)، ص ۱۱۶

۱۴۔ رشید، خان، پروفیسر، ''اُردو کی تین مثنویاں (سحر البیان، قطب مشتری، گلزار نسیم)''، (دہلی: چمن بکڈپو، ۱۹۸۶ء، طبع اوّل، ص ۸

۱۵۔ زیدی، شیراز، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: علمی و ادبی خدمات''، (کراچی: سعید پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۱۲

۱۶۔ سروری، عبدالقادر، ''اُردو مثنوی کا ارتقا''، (حیدر آباد دکن: ادارۂ ادبیات اُردو، ۱۹۴۰ء)، ص ج

۱۷۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، ''حالی کی اُردو کی نثر نگاری''، طبع دوم، (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۵۹

۱۸۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، ''ولی سے اقبال تک''، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۳۵

۱۹۔ عبدالودود، قاضی، ''میر کے حالاتِ زندگی''، مشمولہ ''میر تقی میر، میر شناسی: منتخب مضامین'' مرتبین ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء)، ص: ۲۱

۲۰۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، ''اُردو کی منظوم داستانیں''، (کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۲ء)، اشاعت دوم، ص ۱۵

۲۱۔ _____، ''تنقیدی شذرات و مقالات''، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۴

۲۲۔ _____، ''میر کو سمجھنے کے لیے''، (لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۸

۲۳۔ وارثی، سعیدہ، ڈاکٹر، ''مطالعۂ مثنویاتِ مصحفیؔ''، (نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۵ء)، ص ۷۱

۲۴۔ انصاری، سحر، پروفیسر، ''ڈاکٹر فرمان کچھ یادیں کچھ باتیں'' مشمولہ ''نگار پاکستان''، کراچی، ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری نمبر''، جولائی۔اکتوبر ۲۰۱۳ء، ص ۳۱

۲۵۔ اشرف، اے بی، ڈاکٹر ''داستان شناسی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری'' مشمولہ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری: احوال و آثار''، مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۶